وویکانند

رومیں رولاں

ووِیَکانند

ویویکانند

رومیں رولاں

مترجم

احتشام حسین

ساہتیہ اکاڈمی۔ نئی دِلّی

Vivekananda: Urdu translation by Ehtesham Hussain of the life of Swami Vivekananda as told by Romain Rolland. Published as a Centenary edition in Indian languages by Sahitya Akademi, New Delhi, with kind permission of the Advaita Ashrama, Mayavati (1963). Price Rs. 4.50.

پہلا ایڈیشن سنہ ۱۹۶۳ء

ناشر

انڈین اکیڈمی ۲۹ نرینڈر پلیس۔ نئی دِلی

قیمت :- چار روپے پچاس نئے پیسے

یونین پرنٹنگ پریس۔ دہلی

سوامی وویکانند کی یہ سوانح عمری رومیں رولاں
کی دو تصنیفات **لائف آف رام کرشن** اور
لائف آف وویکانند کے آدھار پر تیار کی گئی
ہے۔ وویکانند کے صد سالہ جشن کے موقع پر
ادویت آشرم مایاوتی کی اجازت سے ہندوستانی
زبانوں میں اسے ساہتیہ اکادیمی کی طرف سے شائع
کیا جا رہا ہے۔

فہرست

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	اپنے مشرقی قارئین سے	۹
۲	سری رام کرشن	۱۶
۳	محبوب شاگرد - نرن	۳۹
۴	پری ورراجک	۷۶
۵	زائر ہندوستان	۸۷
۶	مغرب کا عظیم سفر	۹۸
۷	امریکہ میں تبلیغ	۱۱۱
۸	ہندوستان اور یورپ کا ملاپ	۱۲۵
۹	ہندوستان کی واپسی	۱۴۱
۱۰	رام کرشن مشن کا قیام	۱۵۵
۱۱	مغرب کا دوسرا سفر	۱۸۵
۱۲	کوُچ	۱۹۳

اپنے مشرقی قارئین سے

ہندوستانی پڑھنے والوں سے میری گذارش ہے کہ اگر وہ میری کوئی غلطی دیکھیں تو شفقت سے کام لیں۔ اس کام میں میں نے جتنا جوش اور ولولہ صرف کیا ہے اس کے باوجود میں یہ جانتا ہوں کہ ایک مغرب کے انسان کا ایشیا کے ایسے لوگوں کی ترجمانی کرنا ناممکن ہے جن کے فکری تجربے ہزار ہا سال پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس میں غلطی ہونا ناگزیر ہے۔ ہاں اتنی بات میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرا خلوص ہے جس نے مجھے زندگی کے ہر طرز کے سمجھنے کی پاک کوشش پر آمادہ کیا ہے۔

اسی کے ساتھ مجھے اس بات کا اعتراف بھی کرنا چاہئے کہ ایک مغربی انسان ہونے کی حیثیت سے میں اپنی آزادیٔ رائے کے ایک شمہ سے کبھی دست بردار نہیں ہوا ہوں میں ہر شخص کے عقیدے کا احترام ہی نہیں کرتا بلکہ کبھی کبھی اس سے محبت بھی کرتا ہوں گو اس کی تائید نہیں کرتا۔ رام کرشن (پرم ہنس) میرے دل کے بہت قریب ہیں کیونکہ میں انھیں اُن کے مقلدوں کی طرح "اوتار" نہیں مانتا، ایک انسان سمجھتا ہوں۔ میں ویدانت کے ماننے والوں کی طرح اس بات کو ضروری نہیں سمجھتا کہ خدا کو کسی برگزیدہ شخص کے اندر محدود کر دیا جائے تاکہ

یہ بات تسلیم کی جا سکے کہ خدا رُوح میں بستا ہے اور رُوح ہر چیز میں جاری و ساری ہے یعنی آتما ہی برمھ ہے۔ وہ یہ نہیں مانتا لیکن درحقیقت یہ رُوح کی ایک طرح کی "قوم پرستی" ہے جسے میں تسلیم نہیں کر سکتا۔ میں تو ہر وجود میں خدا کو دیکھتا ہوں۔ میں اُسے مکمل طور سے ہر چھوٹے سے چھوٹے جزو میں بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جیسے کائنات میں۔ ذاتِ مطلق میں کوئی فرق نہیں آتا اور قوت آفاقی حیثیت سے لامحدود ہے۔ کوئی سمجھ سکے تو جو طاقت ذرّے کے اندر چھپی ہوئی ہے ساری دُنیا کو اُڑا سکتی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ وہ ایک ضمیر کے، یا ذات میں، یا قوت کی ایک اکائی میں، یا ایک برق پارے میں مرکوز ہو گئی ہے۔ بڑی سے بڑی شخصیت بھی اس آفتاب کا صرف ایک واضح عکس ہے جو شبنم کے ایک قطرے میں جگمگا رہا ہے۔

اسی وجہ سے میں اس مقدس فرق کو دین داروں کے لئے خوشنما انداز میں نہیں پیش کر سکتا وہ فرق جو روحانی پیشواؤں اور اُن کے ہزارہا پرانے اور نئے گمنام معتقدوں میں پایا جاتا ہے جس طرح مسیح اور گوتم بدھ کو جو روحوں کے اُس عظیم الشان کارواں سے الگ نہیں کرتا جو اپنے عہد میں رواں دواں تھا، اُسی طرح رام کرشن اور وویکانند کو بھی الگ نہیں کرتا۔

-

وے نیو کرسمس ۱۹۲۸ء

رُومیں رُولاں

ابتدائیہ

جس عظیم المرتبت شاگرد (وویکانند) نے یہ بوجھ اُٹھایا کہ وہ رام کشن (پرم ہنس) کے روحانی ورثے کو لے کر اس کی تخم ریزی تمام دُنیا میں کرے، وہ جسمانی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے اُن سے قطعاً مختلف تھا۔

فرشتہ خصال مرشد نے اپنی ساری زندگی ربانی محبوبہ اور ماتا یعنی کالی دیوی کے قدموں میں گزاری تھی۔ وہ بچپن ہی سے اُن کی بھینٹ چڑھ چکے تھے، اپنی ذات کا شعور حاصل کرنے سے پہلے انھیں یہ شعور ہو گیا تھا کہ ان کو اس دیوی سے عشق ہے۔ اگرچہ اس میں پھر سے جذب ہونے کے لئے انھیں برسوں کرب ناک اذیتوں میں گرفتار رہنا پڑا لیکن ان کی حیثیت وہی تھی جو سُورماؤں کی ہوتی ہے۔ ان آزمائشوں کا واحد مقصد یہ تھا کہ وہ انھیں اپنی پاکیزہ اور رُوحانی محبت کے قابل بنائیں۔ وہی اور صرف وہی، ہزار ہا رخوں سے نمایاں ہونے والی کثیر العناصر دیوی تھی جہاں جنگل کی تمام پیچ در پیچ راہیں جا کر ختم ہوتی تھیں۔ جب اُنھوں نے اُسے پالیا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے تمام دوسرے چہروں کو بھی پہچان لیا ہے اور اسی کے ذریعہ اُن سے محبت کرنا سیکھ لیا ہے۔ اس طرح اس کے توسط سے وہ پوری دنیا سے ہم آغوش ہو گئے۔ ان کے

بعد اُن کی عمر کا باقی حصّہ اس آفاقی مسرت کے پرسکون اور بھرپور احساس میں گذرا، وہ مسرت جس کا اظہار مغرب کے لئے بی تھوون اور شِلر نے کیا

انھوں نے اس بات کو ہمارے المیہ کے ہیروؤں سے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔ بی تھوون کو مسرت متصادم بادلوں کے انتشار میں ایک نیلی کرن کی طرح نظر آتی تھی اور پرم ہنس (ہندوستانی ہنس) نے اپنے عظیم الشان سفید شہپر، وقت کے پرشور ہنگاموں سے دُور، ابد کی نیلگوں جھیل پر موت کے بعد آنے والی نامعلوم زندگی میں پھیلا دیتے تھے۔

یہ بات اُن کے سب سے زیادہ گراں قدر شاگردوں کو بھی نصیب نہیں تھی کہ اُن کی ہمسری کریں۔ ان میں سے جو سب سے پُر عظمت تھا، وہ جس کی رُوح سب سے زیادہ وسیع شہپر رکھتی تھی یعنی وویکا نند، وہ بھی بس کبھی کبھی طوفانوں کے درمیان اتفاقی پرواز سے وہ بلندیاں حاصل کر سکتا تھا، یہ بات بھی مجھے بار بار بی تھوون کی یاد دلاتی ہے۔ پرسکون لمحات میں بھی اس کی کشتی کے بادبان ہر جانب سے چلنے والی ہواؤں سے بھرے رہتے تھے۔ دنیوی شور و شغب اور زمانے کے مصائب اُس کے گرد بھوکی مرغابیوں کی طرح اپنے پر پھڑپھڑاتے رہتے تھے۔ اس کے شیر کے سے دل میں قوت کی زبردست لہریں اٹھا کرتی تھیں۔ وہ مجسم قوت تھا اور انسانوں کے لئے اس کا پیام عمل۔ بی تھوون کی طرح اُس کے خیال میں یہی تمام نیکیوں کی اصل تھی۔ جو مجہولیت مشرق کے متحمل گلے میں دنیوی جوا بن کر ایک بوجھ کی طرح لٹکتی رہتی ہے اس مجہولیت سے نفرت کرنے میں وہ اس حد تک آگے بڑھا کہ اُسے کہنا پڑا، "سب سے بڑی بات یہ ہے کہ طاقتور بنو! مرد بنو! میرے دل میں اس کی بھی عزت ہے جو بدکار ہے بشرطیکہ وہ طاقتور ہو کیونکہ کسی نہ کسی دن اس کی طاقت اُسے بدکاری سے باز رکھے گی یا خود غرضانہ مقاصد کے ترک کر دینے پر آمادہ کرے گی اور اس طرح آخر کار اُسے

سچائی تک پہونچا دے گی۔"

وویکانند کا ورزشی جسم رام کرشن کے نازک اور کمزور لیکن تار کی طرح بٹے ہوئے جسم سے مختلف تھا۔ ان کا قد بلند (پانچ فٹ ساڑھے آٹھ انچ)، کندھے چوڑے، سینہ پھیلا ہوا تھا۔ وہ تنومند بلکہ بھاری بھرکم تھے، بازو بھرے ہوئے اور ہر طرح کے کھیل کی مشق سے مضبوط تھے۔ رنگ زیتونی اور چہرہ بھرا ہوا تھا، ماتھا چوڑا اور جبڑے طاقتور تھے، آنکھیں شاندار، بڑی، سیاہ اور نمایاں تھیں جن پر بھاری پپوٹے دیکھ کر کنول کی پتّی سے مشابہت کا خیال آتا تھا۔ ان کی نگاہوں کے سحر سے کوئی چیز بچ نہیں سکتی تھی۔ اُن میں بے اختیار کشش سے کسی کو اپنے اندر جذب کر لینے، ذکاوت، طنز اور شفقت سے چمک اُٹھنے، شدتِ مسرّت میں کھو جانے، شعور کی گہرائیوں میں بے باکانہ دھنس جانے اور اس کی تابناکی میں جل بجھنے کی صلاحیت یکساں طور پر موجود تھی لیکن اُن کی سب سے نمایاں صفت ان کی شاہانہ شان تھی۔ وہ پیدائشی بادشاہ تھے اور وہ چاہے ہندوستان ہو یا امریکہ، ان کی سطوت کو خراجِ عقیدت پیش کئے بغیر کوئی اُن کے قریب نہیں آسکتا تھا۔

جب مجلسِ مذاہب (پارلیمنٹ آف ریلیجنس) کے افتتاحی اجلاس میں، جسے کارڈنل گبنس نے ستمبر ۱۸۹۳ء میں شکاگو میں منعقد کیا تھا، تیس سال کا یہ گمنام جوان شریک ہوا تو اس کے پرشوکت وجود کے سامنے دوسرے تمام لوگ ماند پڑ گئے۔ اُن کی قوت اور حسن، طرزِ عمل کی لطافت، اور شان، آنکھوں کی سیاہ چمک، بارعب شکل اور جیسے ہی انھوں نے بولنا شروع کیا ان کی بھرپور گہری آواز کی شاندار موسیقی نے امریکی اینگلو سیکسنوں کے اس زبردست مجمع کو مسحور کر لیا۔ یہی لوگ اس سے پہلے اُن کے رنگ کی وجہ سے اُن کے خلاف تھے۔ ہندوستان کے اس سورما پیغامبر کے خیالات نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ پر گہرا اثر ڈالا۔

وہ جہاں کہیں بھی جاتے تھے اُن کی جگہ پہلی ہوتی تھی، انھیں دوسرے درجے پر سوچنا ناممکن تھا۔ یہاں تک کہ اُن کے گرو رام کرشن نے بھی اپنے ایک مکاشفہ میں اپنے اس محبوب شاگرد کے سلسلہ میں خود کو ایک رشی کی بغل میں ایک بچے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ وویکانند بے سُود اپنی خاکساری اور فروتنی میں اس طرح کے خراجِ عقیدت کو قبول کرنے سے انکار کیا کرتے تھے لیکن ہر شخص پہلی ہی نظر میں انھیں ایک رہنما، ایک برگزیدۂ خدا اور ایک حاکمانہ قوت رکھنے والی ہستی تسلیم کر لیتا تھا۔ ہمالیہ کے پہاڑوں میں ایک سیّاح جو انھیں نہیں جانتا تھا راستے سے گزرتے ہوئے دیکھ کر حیرت سے رک گیا اور چلّایا "شیو!"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے یہ دیوتا نے اپنا نام اُن کی پیشانی پر کندہ کر دیا تھا۔

لیکن رُوح کے اندر چلنے والی چو طرفہ ہواؤں سے یہی پیشانی ایک ڈھلوان گھاٹی کی طرح طوفان زدہ بھی تھی۔ انھیں شاذ و نادر ہی سکون بخش ہواؤں اور خیالات کی ان شفّاف وسعتوں سے لُطف حاصل کرنے کا موقع ملتا جن پر رام کرشن کا تبسّم منڈلاتا رہتا تھا۔ اُن کا غیر معمولی توانا جسم اور وسیع دماغ، اُن کی طوفان زدہ رُوح کے ہر طرح کے جھٹکوں کے لئے میدانِ جنگ بنا ہوا تھا۔ حال اور استقبل، مشرق اور مغرب، خواب اور عمل سب ہی ایک دوسرے پر فتح پانے کی جدّوجہد میں لگے رہتے تھے۔ وہ اپنی فطرت کے کسی جُز یا سچائی کے کسی پہلو سے دست بردار ہو کر اُن میں ہم آہنگی قائم کر سکتے تھے، اس کا انھیں علم تھا اور اس میں بہت کچھ کامیاب بھی ہو سکتے تھے۔ زبردست متصادم قوتوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں برسوں لگ گئے، جنھوں نے اُن کی ہمّت ہی نہیں زندگی کو بھی تپا ڈالا۔ یہ جنگ اور زندگی ان کے لئے مترادف تھے۔ زندگی کے دن گِنے ہوتے ہوتے ہیں، رام کرشن اور اُن کے عظیم المرتبت

شاگرد کی موت میں سولہ سال، بھڑکتی ہوئی آگ کے سولہ سالوں کا فاصلہ تھا۔ ابھی ان کی عمر چالیس سال کی بھی نہیں تھی کہ اُن کا ورزشی جسم چتا پر پہونچ گیا......

لیکن اس چتا کے شعلے آج بھی روشن ہیں۔ پُرانے قِصّوں کے پُراسرار طائرِ ققنس کی طرح، اُن کی راکھ سے ہندوستان کا ضمیر اپنی وحدت اور ویدک عہد کے مفکرانہ عظیم الشان پیغام کے لئے پھر جاگ اُٹھا ہے، وہ پیغام جسے اُن کی قدیم قوم کی خواب آفریں روحوں نے پیش کیا تھا اور اس کو باقی تمام دنیا کے سامنے جس کا حساب دینا ہوگا۔

سری رام کرشن

بنگال کے ایک تکونے سے گاؤں کمرپوکور میں، جو تالابوں، دھان کے کھیتوں اور کھجوروں کے جھنڈ کے درمیان آباد تھا، ایک دین دار برہمن میاں بیوی رہتے تھے جنہیں چیٹو پادھیا کہا جاتا تھا۔ وہ بہت غریب لیکن بہت مذہب پرست تھے اور بہادر اور مقدس رام کے معتقد تھے۔ بوڑھا برہمن جو شما نے لوگوں کی طرح نیک اور سیدھا سادا تھا اپنے ایک پڑوسی دولت مند زمیندار کی موافقت میں جھوٹی گواہی دینے سے انکار کر کے اپنی ساری جائداد کھو چکا تھا۔ اسے دیوتاؤں کی جانب سے بشارت ہوئی اور اگرچہ اس وقت اُس کی عمر ساٹھ سال کی ہو چکی تھی وہ تیرتھ یاترا کے لئے گیا روانہ ہو گیا، جہاں وشنو کے قدم کا نشان پایا جاتا ہے۔ دیوتا نے رات کو اپنے درشن دیئے اور کہا "میں جلد ہی دنیا کی نجات کے لئے پھر جنم لینے والا ہوں۔"

تقریباً اسی وقت کمرپوکور میں اس کی بیوی چندرامنی نے خواب دیکھا کہ اُس پر دیوتا آئے ہیں۔ اس کے جھونپڑے کے سامنے والے مندر میں شیوجی کی ربانی مورت اس کے دیکھتے ہی دیکھتے زندہ ہو گئی اور روشنی کی ایک کرن اس کو اپنے وجود کے اندر داخل ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس طوفانی

صورتِ حال میں چندر امنی گری اور بیہوش ہو گئیں۔ جب یہ دیوتا کی شکار ہوش میں آئی تو حاملہ ہو چکی تھی۔ شوہر نے واپس آکر اُسے بدلا ہوا پایا۔ اب وہ آوازیں سننے لگی تھی۔ کیونکہ اس کے بطن میں ایک دیوتا تھا۔

وہ بچہ جسے دنیا بعد میں رام کرشن کے نام سے جاننے والی تھی، ۱۸ فروری ۱۸۳۶ء کو پیدا ہوا۔ بچپن میں اُن کا نام گدادھر رکھا گیا جو لحن سے بجتی ہوئی گھنٹی کی گونج کی طرح خوش آہنگ تھا۔ اُن کا بچپن کھیل کود اور زندہ دلی، شرارت اور دلکشی سے بھرا ہوا تھا جس میں ایک طرح کی لطیف نسائیت تھی اور جو آخر عمر تک باقی رہی۔ کوئی، اور خود وہ، یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس ہنس مکھ بچے کے چھوٹے سے جسم کے اندر کتنی لامحدود پہنائیاں اور زبردست گہرائیاں چھپی ہوئی ہیں۔ ان کا انکشاف اس وقت ہوا جب وہ چھ سال کے تھے۔ جون یا جولائی ۱۸۴۲ء میں ایک دن وہ کچھ بھُنے ہوئے چاول اپنے دامن میں لئے کھاتے ہوئے گھوم رہے تھے، اُن کے قدم کھیتوں کی طرف تھے ...... "میں دھان کے کھیتوں کے درمیان ایک پتلی سی مینڈ پر چل رہا تھا، آسمان کی جانب آنکھ اٹھاتے ہوئے میں نے چاول کی ایک پھنکی لگائی اور دیکھا کہ کالے بادل کا ایک بڑا سا ٹکڑا تیزی سے پھیل رہا ہے، یہاں تک کہ اس نے آسمان کو گھیر لیا۔ یکایک بادل کے ایک کنارے پر برف جیسے سفید سارسوں کی ایک قطار میرے سر کے اوپر سے گذری۔ یہ تقابل ایسا حسین تھا کہ میری روح اس کے ساتھ بہت دور چلی گئی۔ میں نے حواس کھو دئے اور زمین پر گر پڑا۔ چاول زمین پر بکھر گئے۔ کسی نے مجھے اٹھا لیا اور اپنی گود میں لے کر میرے گھر پہنچا دیا مجھ پر مسرت اور پُر جوش جذبات کا غلبہ ہو گیا ...... یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے شدت مسرت اور جذب کا احساس ہوا۔"

اس کے بعد مجذوبیت کے یہ لمحے جلد جلد آنے لگے۔ یورپ میں اسے کسی بُرے انجام کا پیش خیمہ سمجھ لیا جاتا اور بچّے کو فوراً ہی کسی پاگل خانے میں پہنچا دیا جاتا جہاں اُسے ہر روز دماغی امراض کے نفسیاتی علاج کی پچکاری لگتی۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ یہ شعلہ سرد ہو جاتا اور طلسماتی لالٹین بجھ جاتی "شمع گل ہوگئی!" کبھی کبھی بچّے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی جہاں صدیوں سے ایسی طلسماتی لالٹینوں کے جلوس نکلتے رہے ہیں، لوگ متفکر ہوئے اور ان کے ماں باپ بھی، جن پر دیوتاؤں کی نگاہِ کرم تھی، بچّے کی اس حالت سے خوفزدہ ہو گئے۔ لیکن ان خاص حالتوں کے علاوہ ان کی صحت بالکل ٹھیک تھی اور بہت سی خداداد صلاحیتوں کے باوجود کسی طرح غیر معتدل نہیں کہی جا سکتی۔ ان کی ایجاد پسند انگلیاں مٹی سے دیوتاؤں کی مورتیاں بنایا کرتی تھیں اور ان کے عجیب و غریب قصّے اُن کے ذہن میں پروان چڑھتے تھے۔ وہ سری کرشن کے متعلق شبانی گیت والہانہ انداز سے گاتے تھے۔ کبھی کبھی ان کا قبل از وقت پختہ ہو جانے والا ذہن اہلِ علم کے مباحثوں میں بھی حصّہ لیتا اور انھیں اس طرح متحیر کر دیتا تھا جیسے مسیح یہودی علماء کو متحیر کر دیتے تھے۔

جب ان کی عمر صرف سات سال کی تھی، باپ کا انتقال ہو گیا۔ چند سال خاندان کے لئے بڑی پریشانی میں گذرے، کیونکہ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ سب سے بڑے لڑکے رام کمار نے کلکتہ کی راہ لی اور وہاں ایک اسکول کھول لیا۔ انھوں نے ۱۸۵۲ء میں اپنے چھوٹے بھائی کو بھی اپنے پاس بلا لیا کیونکہ اب وہ بالغ ہو رہا تھا، لیکن اس نے اپنی باطنی زندگی کی لگن اور غیر تربیت یافتہ طبیعت کے تقاضوں سے پڑھنا لکھنا گوارا نہ کیا۔

اُس زمانے میں ایک عورت تھی جس کا نام رانی رسمنی تھا، وہ ایک نیچی ذات سے تعلق رکھتی تھی۔ دریائے گنگا کے مشرقی کنارے پر، کلکتہ سے کوئی چار میل دُور دکشنیشور میں

اُس نے عظیم المرتبت دیوی، ربّانی ماں یعنی کالی ماتا کے ایک مندر کی بنیاد رکھی تھی۔ اُسے اس میں بڑی دشواری ہوئی کہ کوئی برہمن اس کا پروہت بننے کے لئے مل جائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اگرچہ مذہب پرست ہندوستان میں سادھوؤں، سنتوں اور روشن ضمیروں کی بہت عزت کی جاتی ہے لیکن ایک تنخواہ دار پروہت یا پجاری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یورپ کی طرح وہاں مندر، خدا کے جسم اور دل یا اس کی روزانہ کی قربانیوں کی درگاہ نہیں ہوتے بلکہ دولت مندوں کی قابلِ تحسین خدمت کی بنیادیں ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ خدا سے قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ سچا مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے جس کا مندر ہر انفرادی روح ہے۔ یہاں ایک اور دشواری یہ تھی کہ مندر کی بانی ایک شودر عورت تھی اور کسی برہمن کا اس جگہ کو قبول کرنا ایک بڑی گری ہوئی بات ہوتی۔ رام کمار نے کسی طرح ۱۸۵۵ء میں اس کو قبول کر لیا تھا لیکن اُن کے چھوٹے بھائی نے جو ذات پات کے معاملہ میں بہت سخت تھے بڑی مشکل سے اس خیال کی تائید کی۔ آہستہ آہستہ اُن کی نفرت بھی کم ہوتی گئی اور جب اگلے سال اُن کے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا تو رام کرشن نے اس جگہ پر کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کالی دیوی کا یہ نیا پجاری کُل بیس سال کا تھا۔ اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اُس نے کسی خوفناک دیوی کی خدمت کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ ایک ہونکتی ہوئی شیرنی کی طرح جو اپنے شکار کو مسحور کر لیتی ہے، دیوی بھی اُسے اپنی خوراک بنانا چاہتی تھی لیکن دس سال کی طویل مسحور کن مدّت تک وہ اس کے ساتھ کھیلتی رہی اور یہ مُدت اس کی روشن پُتلیوں کے سامنے میں گذری۔ رام کرشن دیوی کے ساتھ مندر میں تنہا رہتے تھے لیکن جھکڑوں والے طوفان کے مرکز پر، کیونکہ معتقدوں کے انبوہ کی گرم سانسیں مندر کے دروازے سے اس طرح گذر جاتی تھیں جیسے برسات کی موسمی ہوا گرد و غبار کے چھوٹے چھوٹے جھکولوں کو اُڑا لے جاتی ہے۔

اس مندر میں لاتعداد زائر، سادھو، سنت، ہندو اور مسلمان فقرا، آتے رہتے اور اس طرح وہاں خدا کے دیوانوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو جاتا۔

بہت دنوں بعد کی بات ہے جب ایک دفعہ وویکانند نے رام کرشن سے پوچھا: "کیا آپ نے ایشور کو دیکھا ہے؟" تو انھوں نے جواب دیا: "میں اس کو اسی طرح دیکھتا ہوں جیسے تمھیں دیکھ رہا ہوں، فرق یہ ہے کہ اس سے بہت زیادہ شدت احساس کے ساتھ" اس کا مطلب یہ تھا کہ غیر شخصی اور مطلق شکل میں نہیں دیکھتے حالانکہ وہ اس کی مشق بھی کرتے تھے۔

لیکن ۱۸۵۸ء تک رام کرشن نے اس پر مکمل قدرت حاصل نہیں کی تھی۔ ابھی انھیں بہت سارا راستہ طے کرنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں خدا کا یہ متلاشی اپنی آنکھیں بند کئے ایک ایسے اندھے آدمی کی طرح چلتا تھا جس کا کوئی رہنما نہ ہو۔ سیدھے راستے پر چلنے کے بجائے وہ جھاڑیوں کے گھیرے کو توڑ کر اپنا راستہ بنا لیتے اور گڑھوں میں گر پڑتے تھے اس کے باوجود وہ آگے ہی بڑھتے جاتے تھے۔ ہر دفعہ گرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوتے اور اپنی راہ پر پھر چل نکلتے۔

یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ وہ مغرور یا ضدی تھے، وہ بیحد سادہ انسانوں میں تھے۔ اگر آپ انھیں بتا دیتے کہ ان کی یہ حالت مریضانہ ہے تو وہ آپ سے اس کا علاج پوچھتے اور اس علاج پر عمل کرنے میں نہ ہچکچاتے۔

کچھ دنوں کے لئے وہ اپنے وطن کمرپوکر بھیج دئے گئے۔ ان کی ماں کی خواہش تھی کہ وہ شادی کر لیں۔ اُن کو امید تھی کہ شادی ان کی اس روحانی آسیب زدگی کا علاج کر دے گی۔ انھوں نے کوئی عذر پیش نہیں کیا بلکہ اس خیال پر ایک معصوم خوشی ظاہر کی لیکن یہ کیسی عجیب

شادی کی تھی! اس سے زیادہ حقیقی کسی طرح نہیں (بلکہ اصل میں اس سے بہت کم) جیسی ہوتی تھی انھیں دیوی سے تھی۔ اُن کی بیوی کی عمر (۱۸۵۹ء میں) صرف پانچ سال کی تھی۔

جب شادی کی رسمیں ادا ہوگئیں تو حسبِ رواج لڑکی اپنے والدین کے گھر واپس بھیج دی گئی اور پھر اس نے اپنے شوہر کا چہرہ آٹھ نو سال تک نہیں دیکھا۔ رام کرشن جنھوں نے اپنی ماں کے گھر میں بظاہر کچھ سکون حاصل کر لیا تھا، اپنے مندر میں واپس گئے۔

کالی دیوی اُن کی منتظر تھیں۔ ابھی انھوں نے مشکل سے مندر کی دہلیز میں قدم رکھا ہوگا کہ وہی ربّانی مجذوبیت کی کیفیت غیر معمولی شدت سے پھر اُن پر طاری ہوگئی۔ ایک دفعہ پھر بڑے طویل وقفوں کے لئے اُن کی آنکھوں نے بند ہونا چھوڑ دیا۔ انھیں محسوس ہونے لگا کہ اُن پر جنون کا دورہ پڑنے والا ہے اور خوف زدہ ہوکر انھوں نے دیوی سے التجائیں کیں۔ کالی ماتا کا درشن ہی اُن کی بقا کا واحد سہارا تھا۔ اس مذہبی مدہوشی اور نااُمیدی کا دورہ دو سال تک رہا۔

آخر کار مدد پہونچ گئی۔

اس منزل تک وہ اتفاقات کے رحم وکرم پر ایک بے تھاہ اور بے کنار دریا میں تنہا پیر رہے تھے۔ اس میں روح کے شور کرتے ہوئے آبشار بھی تھے اور گرداب بھی۔ وہ واماندگی کے آخری کنارے پر پہونچ چکے تھے جب دو ایسی ہستیاں منظر پر نمودار ہوئیں جنھوں نے اُن کو ڈوبنے سے بچا لیا اور انھیں سکھایا کہ ندی کو پار کرنے کے لئے دھارے سے کس طرح کام لینا چاہئے۔

ایک دن وہ اپنے چبوترے سے دریائے گنگا کی سطح پر روانی سے تیرتی ہوئی رنگا رنگ بادبانوں والی کشتیوں کو دیکھ رہے تھے کہ اُن میں سے ایک آکر اُن کے چبوترے کے کنارے لگ گئی اور اس میں سے ایک عورت اتر کر سیڑھیوں پر آئی۔ وہ بالا قد اور خوبصورت تھی، اس کے

لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ سنیاسیوں کا سا کیسری جامہ پہنے ہوئے تھی۔ اس کی عمر کوئی پینتیس چالیس سال کے درمیان ہوگی لیکن دیکھنے میں وہ اس سے کم عمر کی معلوم ہوتی تھی۔ رام کرشن اس کی شکل وصورت سے متاثر ہوئے اور اُسے بلوایا۔ وہ آئی اور ان کی طرف دیکھتے ہی پھوٹ کر رونے لگی "میرے فرزند! میں تو بہت دنوں سے تمھاری تلاش میں تھی۔"

وہ بنگال کے ایک شریف برہمن خاندان سے تھی، وشنو کی بھگت تھی، اُس نے اعلیٰ تعلیم پائی تھی اور مقدس صحیفوں، خاص کر بھگتی کی کتابوں کی عالم تھی۔ اس نے کہا کہ اُسے ایک ایسے ہی شخص کی تلاش تھی جسے خدائی فیضان حاصل ہو۔ ہم کا انکشاف اس سے روحِ مطلق نے کیا تھا اور اس کے لئے ایک پیغام بھی سونپا تھا۔ کسی مزید تعارف، یہاں تک کہ نام ظاہر کئے بغیر (اس کا بھیروی برہمنی یعنی برہمن راہبہ کے علاوہ اور کبھی کوئی نام نہیں لیا گیا) اس مقدس خاتون اور کالی دیوی کے پجاری کے درمیان ماں بیٹے کا رشتہ اسی وقت اور اسی جگہ قائم ہو گیا۔ رام کرشن نے ایک بچے کی طرح انھیں اپنا راز دار بنا لیا اور حصولِ معرفت کے سلسلہ میں اپنی زندگی کے سارے تکلیف دہ تجربے، اپنی ریاضت (سادھنا) اور اپنی جسمانی اور ذہنی تکالیف کا سارا حال بیان کر دیا۔ انھوں نے ان سے یہ بھی بتایا کہ بہت سے لوگ انھیں مجنون سمجھتے ہیں اور خود اُن کی رائے دریافت کی کہ کیا یہ درست ہے؟ بھیروی نے یہ سارے اعترافات سن کر ایک مادرانہ شفقت کے ساتھ تسلی دی اور کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے، کیونکہ وہ کسی رہنمائی کے بغیر خود اپنی کوششوں سے سادھنا کی ایسی بلند ترین منزل پر پہونچ گئے ہیں جس کا ذکر بھگتی کے صحائف میں پایا جاتا ہے، اُن کی تکلیفیں محض ان کے عروج کے زینے تھیں۔ وہ اُن کے جسمانی آرام کی دیکھ بھال کرتیں اور ان کے ذہن کو روشنی پہنچاتی تھیں انھوں نے رام کرشن کو ان کی روشنی میں پھر اسی راہ پر پیچھے واپس کیا جسے انھوں نے تنہا آنکھیں بند

کرکے سات میں طے کیا تھا۔ صرف اپنے وجدان سے انھوں نے کئی سال کی مدت میں وہ "تجلیات" حاصل کرلی تھیں جو نظامِ تصوّف نے صدیوں میں حاصل کی تھیں لیکن وہ اس وقت تک اُن پر پوری طرح قدرت نہیں حاصل کرسکتے تھے جب تک انھیں وہ راستے نہ دکھا دئے جائیں جن پر چل کر وہ وہاں تک پہونچے تھے۔

ان کو راہِ ہدایت سے روشناس کرنے والی خاتون نے یہ دیکھ لیا تھا کہ وہ خدا کے اوتار ہیں۔ اس مقصد کے لئے بھیروی نے دکشنیشور میں ایک مجلس منعقد کی اور پنڈتوں سے عالمانہ بحث مباحثہ کرکے اس پر زور دیا کہ یہ مذہبی پیشوا اس نئے اوتار کو اعلانیہ تسلیم کرنے پر رضامند ہوں۔

اس کے بعد سے ان کی شہرت پھیلنے لگی۔ لوگ دُور دُور سے اس عجیب وغریب انسان کو دیکھنے کے لئے آنے لگے جس نے نہ صرف ایک سادھنا میں کامیابی حاصل کی تھی بلکہ ہر ایک میں۔ سنیاسی، علماء، سادھو اور مجذوب، ہر طرح کے ریاضت کش جو کسی نہ کسی مسلک پر چل کر خدا تک رسائی حاصل کرنا چاہتے تھے، ان کے پاس مشورے کے لئے آنے لگے کیونکہ اب وہ کھلی سڑک پر بیٹھ گئے تھے اور تمام لوگوں میں برسرِ اقتدار تھے۔ انھیں دیکھ کر ان لوگوں پر جادو کا سا جو اثر ہوتا تھا اس کے متعلق ان کے وہ بیانات موجود ہیں جن میں اُن کے مدّت تک مجذوبیت کی آگ میں تپے ہوئے جسم کی سنہری چمک کا ذکر ہے۔ وہ ڈانٹے کی طرح جہنّم سے نہیں بلکہ موتی نکالنے والے غوطہ خور کی طرح گہرے سمندر سے واپس آئے تھے۔ لیکن آخر عمر تک وہ تمکنت کے معمولی اثر سے بھی دور، ایک سادہ انسان بنے رہے کیونکہ وہ خدا کی محبّت میں اس درجہ سرشار تھے کہ انھیں اپنا ہوش ہی نہ تھا۔ جو کچھ وہ حاصل کرچکے تھے اس کے مقابلے میں وہ اس میں زیادہ مستغرق تھے جو ابھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ وہ خود کو اوتار کہلانا بالکل ناپسند

کرتے تھے اور جب وہ اس منزل پر پہونچ گئے تھے جسے ہر شخص، یہاں تک کہ اُن کی رہنما بھیروی بھی عروج کی آخری چوٹی کہتی تھیں، وہ عروج کی اور منزلوں پر نظر جمائے ہوئے تھے، چوٹی تک پہنچنے کی آخری پھسلنی چڑھائی! وہ اس آخری سرے پر چڑھنے کے لئے مجبور تھے۔

لیکن آخری چڑھائی کے لئے پُرانے ہادی کافی نہیں تھے۔ اس طرح ان کی وہ روحانی ماں، جس نے تین سال تک انھیں بڑی چوکسی سے پالا پوسا تھا، دوسری ماؤں کی طرح یہ دُکھ اٹھانے پر مجبور ہوئی کہ وہ بیٹا جسے اُس نے اپنا دُودھ پلا کر پروان چڑھایا تھا، اس کے ہاتھ سے نکل کر ایک اعلیٰ تر رہنما کے ہاتھ میں چلا جائے، جس کی آواز میں زیادہ تحکم اور زیادہ طاقت تھی۔

۱۸۶۴ئ کے خاتمہ کے قریب ٹھیک اس وقت جب رام کرشن (پرم ہنس) نے شخصی خدا کو رام کر لیا تھا، غیر شخصی خدا کا ایک پیغامبر دکشینیشور میں وارد ہوا۔ اُسے خود اپنے مشن کی خبر نہ تھی۔ یہ توتا پوری (برہنہ شخص) تھا، ایک غیر معمولی ویدانتی تپسوی اور رمتا جوگی، جس نے چالیس سال کی ریاضت کے بعد حقیقتِ مطلق کو پا لیا تھا۔ اُس کی روح آزاد تھی اور اس کی بے تعلق نگاہیں اس بے حقیقت دنیا پر مکمل بے اعتنائی سے پڑتی تھیں۔

توتا پوری نے اِدھر سے گذرتے ہوئے پرم ہنس کو اس طرح دیکھا کہ خود اُن پر کسی کی نظر نہیں پڑی، وہ کسی جگہ تین دن سے زیادہ قیام نہیں کرتے تھے۔ یہ جوان پجاری (رام کشن) مندر کی ایک سیڑھی پر بیٹھا اپنے پوشیدہ عرفان کی مسرت میں غرق تھا۔ توتا پوری کی توجہ اُدھر ہوئی۔ انھوں نے کہا: "میرے بیٹے! مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم حقیقت کی راہ پر بہت دُور آگے چلے گئے ہو، اگر تم چاہو تو میں تمھیں آگے کی منزل تک پہنچنے میں مدد دے سکتا ہوں۔ میں تمھیں ویدانت کی تعلیم دوں گا۔"

رام کرشن نے اس معصوم سادگی سے، جس نے اس خشک راہب کو بھی متبسم کر دیا، جواب دیا کہ انھیں پہلے ماتا (کالی دیوی) سے اجازت لینی ہوگی۔ ماتا نے اجازت دے دی اور انھوں نے خود کو نیاز مندانہ مکمل اعتماد کے ساتھ اس ربّانی معلّم کے سپرد کر دیا۔

لیکن سب سے پہلے انھیں "رسمی داخلہ" کی آزمائش کے لئے تیار ہونا پڑا جس کی پہلی شرط یہ تھی کہ وہ اپنے تمام حقوق اور امتیازات سے دست بردار ہو جائیں، جن میں جنیؤ کا پہننا اور پروہت بنے رہنا بھی شامل تھا۔ اُن کے لئے یہ چیزیں بے حقیقت تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ انھیں اپنے ان علائق اور تصوّرات کا تیاگ کرنا بھی لازمی تھا جن کے سہارے وہ اب تک چل رہے تھے یعنی شخصی خدا اور اپنی سالہاسال کی محبّت اور قربانیوں سے بھی ہمیشہ کے لئے اور اسی وقت مُنھ موڑ لینا تھا۔ گویا رہین کی طرح برہنہ ہو کر علامتی طور سے خود اپنے وجود کی چتا جلا دینے کی رسم ادا کرنا تھا۔ اپنی خودی اور اپنے دل کے بچے کھُچے اجزاء کو دفن کر دینا تھا۔ یہ سب کرنے کے بعد ہی وہ سنیاسی کا کیسری لباس، اپنی نئی زندگی کی علامت کے طور اختیار کر سکتے تھے۔ توتاپوری نے اب انھیں ادویت ویدانت (توحیدی ویدانت) کے بنیادی صفات کی تعلیم دینی شروع کی جو برہمھ ہے اور لاتفریق، اور یہ بتایا کہ اَنا کی تلاش میں کس طرح مستغرق ہونا چاہئے تاکہ برہمھ (وجودِ حقیقی) سے مکمل اتحاد حاصل ہو سکے اور یہ اتّحاد ان کے اندر مراقبہ (سمادھی) کی مدد سے اچھّی طرح جڑ پکڑ لے۔

یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ آخری منزل کے سکڑے دروازے کی کنجی پا لینا اس شخص کے لئے آسان رہا ہوگا جو جذب کی دوسری منزلوں سے گذر چکا تھا۔ اس جگہ خود انھیں کا بیان پیش کر دینا مناسب ہوگا کیونکہ اس کا تعلق محض ہندوستان کی مقدس کتابوں سے نہیں بلکہ مغرب کے محافظ خانوں سے ہے جہاں روحانی انکشاف سے متعلق علوم کی تمام دستاویزیں محفوظ ہیں۔

برہمنہ یوگی (توتاپوری) نے مجھے سکھایا کہ میں تمام اشیاء سے اپنے ذہن کو بے تعلق کرلوں اور آتما کے مرکز میں اُتر جاؤں، لیکن اپنی تمام جدوجہد کے باوجود میں نام اور صورت کی رکاوٹوں کو پار نہ کرسکا اور نہ اپنی رُوح کو لاتعین کی حدوں میں داخل کرسکا۔ مجھے ہر شے سے بے تعلق ہوجانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی، سوا پُرجلال ماتا کے مانوس وجود کے، جو خالص علم کی روح ہیں اور جو میرے سامنے ایک زندہ حقیقت کی طرح موجود تھیں۔ وہ لامحدود کی طرف جانے کا راستہ روک دیتی تھیں۔ میں نے بار بار اس کی کوشش کی کہ اَدویت ویدانت کے اصولوں پر اپنی توجہ مرتکز کردوں لیکن ہر بار ماتا کا وجود درمیان میں حائل ہوجاتا تھا۔ میں نے مایوس ہوکر توتاپوری سے کہا "اس سے کوئی فائدہ نہیں، میں کبھی اپنی رُوح کو لاتعین کی حدوں میں نہیں پہنچاسکوں گا اور کبھی آتما کے روبرو میری رسائی نہیں ہوسکے گی"۔ انھوں نے سختی سے جواب دیا "کیا کہا؟ تم سے یہ نہیں ہوسکتا؟ تمھیں یہ کرنا ہے!" پھر چاروں طرف دیکھ کر انھوں نے شیشے کا ایک ٹکڑا اٹھالیا اور اس کی نوک میری دونوں آنکھوں کے درمیانی حصے میں یہ کہہ کر چبھودی کہ اپنی توجہ اس نقطہ پر مرکوز کردو۔ میں نے پوری طاقت سے مراقبہ شروع کیا اور جیسے ہی ربّانی ماتا کا دلفریب وجود سامنے آیا میں نے اپنے امتیازی شعور کو تلوار کی طرح استعمال کرکے اس کے دو ٹکڑے کردیئے۔ آخری رکاوٹ ہٹ گئی، میری رُوح تیزی سے لاتعین کی حدوں کے آگے نکل گئی اور میں سمادھی میں کھوگیا"۔

اس ناقابلِ حصول منزل کا دروازہ زبردست کوشش اور لامحدود ابتلا کے بعد کھولا جاسکا۔ لیکن ابھی رام کرشن نے اس کی ڈیوڑھی میں مشکل ہی سے قدم رکھا ہوگا کہ "نروِکلپ سمادھی" کی آخری منزل حاصل ہوگئی جہاں موضوع اور معروض یکساں طور پر غائب ہوجاتے ہیں۔

۱۸۶۵ء کے خاتمے کے قریب توتاپوری کے رخصت ہونے کے بعد رام کرشن مزید چھ مہینے تک جادو کے حصار یعنی دائرہ آتش میں رہے اور وجودِ مطلق سے اپنا اتحادِ کامل بُھلاتے رہے

یہاں تک کہ جسمانی قوت برداشت کی حدیں ختم ہوگئیں۔ اگر اس بیان پر یقین کیا جائے تو چھ مہینے تک وہ حالتِ سکوت یا سکتہ کے عالمِ جذب میں رہے، جیسا کہ قدیم عہد کے فقیروں کے متعلق بیان کیا جاتا ہے روح نے جسم کو ایک خالی مکان کی طرح چھوڑ دیا تھا جو ختم کرنے والی طاقتوں کے رحم وکرم پر تھا۔ اگر ایک بھتیجے نے اس بے روح کے جسم کی خبر گیری نہ کی ہوتی اور اُسے قوت نہ پہنچائی ہوتی تو یقیناً ان کا انتقال ہو گیا ہوتا۔ بے نکار کے ساتھ اس مجذوبانہ اتحاد کو اور زیادہ آگے بڑھانا ناممکن تھا۔

رام کرشن نے بعد میں اسے خود محسوس کیا کہ وہ خدا کو آزمارہے تھے اور یہ محض ایک معجزہ تھا کہ وہ واپس آگئے۔ وہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ اپنے شاگردوں کو ہمیشہ اس طرح کی آزمائش سے بچنے کی تلقین کریں۔ انھوں نے وویکانند تک کو اس سے اس بنیاد پر روک دیا کہ اُن پاک روحوں کے لئے یہ ایک قسم کا تعیش ہے جن کا غرض یہ ہے کہ وہ دوسروں کی خدمت کے لئے اپنی مسرتوں کو قربان کردیں۔ جب کم عمر نرن (نریندر یا وویکانند) نے اُن سے التجا کی کہ وہ ان کے لئے نروی کلپ سمادھی یعنی وجود مطلق کی خلیج میں داخل ہونے والے خوفناک راستہ کا دروازہ کھول دیں تو رام کرشن نے جو کبھی غصے کا شکار نہیں ہوتے تھے اور اپنے بیٹے (وویکانند) کا دل دکھلانے سے پرہیز کرتے تھے، بڑے غصہ میں اس بات سے انکار کردیا انھوں نے چلا کر کہا "شرم کرو شرم! میں سمجھتا تھا کہ تم برگد کا وہ چھتنار درخت ہو گے جس کی چھاؤں ہزار ہا تھکی ہوئی روحوں کو سایہ دے گی، اس کے بجائے تم خود غرضی سے اپنی ہی فلاح چاہتے ہو۔ میرے بچے! ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو چھوڑو، اس یک طرفہ آدرش سے تمھیں کیا سکون حاصل ہوگا؟ ہمہ جہتی اور ہمہ گیر بنو۔ خدا سے ہر رنگ میں لطف اٹھاؤ!" (اس سے اُن کا مطلب تھا مراقبہ اور عمل دونوں کا حصول تاکہ وہ اعلیٰ ترین علم کو انسانوں کی اعلیٰ ترین

خدمت میں ڈھال سکیں)

نرن تیاگ کا فرض ادا نہ کرنے پر ذلت اور شکست خوردگی محسوس کرکے رونے لگے۔ بعد میں انھوں نے اس کا اعتراف کیا کہ گرو کی یہ سختی جائز تھی لیکن آخر عمر تک دل میں یہ خلش لئے رہے کہ وہ لامحدود خدا تک نہ پہونچ سکے حالانکہ انھوں نے اپنی پوری زندگی شفقت اور ہمت سے خدمتِ خلق میں لگادی۔

وہ اپنے مندر میں بیٹھے بہت سے مسلمان فقیروں کو اُدھر سے گذرتے دیکھا کرتے تھے کیونکہ دکشینیشور کی فیاض رانی رسمنی نے جو نیچی ذات کی ایک دولت عورت تھی، اپنی دینداری کے جوش میں مندر کے کمتی کمرے اس راہ سے گذرنے والے ہر مذہب کے مسافروں کے لئے وقف کردئے تھے۔ رام کرشن کی نظر ایک حقیر سے مسلمان گووند رائے پر پڑی جو نماز میں مشغول تھا۔ انھوں نے اس کے سجدے میں جھکے ہوئے جسم کے بیرونی خول کے اندر نگاہ ڈال کر یہ محسوس کیا کہ اس شخص نے اسلام کے ذریعے خدا تک رسائی حاصل کرلی ہے۔ انھوں نے گووند رائے سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ انھیں تعلیم دے۔ کتنی دن تک کالی ماتا کا یہ پجاری اپنے دیوتاؤں سے مکمل طور پر دستکش اور غافل رہا۔ رام کرشن نہ تو انھیں پوجتے تھے نہ اُن کے متعلق سوچتے تھے وہ مندر کے احاطے کے باہر رہتے اور اللہ کے نام کا ورد کرتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کا سا لباس پہن لیا تھا اور حد یہ تھی کہ وہ مقدس جانور، گائے کا گوشت کھانے پر آمادہ تھے! اُن کے آقا اور سرپرست ماتھر بابو اس بات پر خوفزدہ ہو گئے اور اس سے باز آنے کی التجا کرنے لگے۔ انھوں نے خفیہ طور پر ایک مسلمان کی نگرانی میں برہمن سے کھانا پکوایا تاکہ وہ بھرشٹ (نجس) ہونے سے بچ جائیں۔ اس پُرجوش آرٹسٹ کا اس طرح مکمل طور سے خود کو ایک دوسرے دائرۂ فکر کے سپرد کردینا، ہمیشہ کی طرح ایک روحانی سفر کی حیثیت رکھتا تھا جس میں تصورات کو

بچشم خود دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ (انھیں دنوں) ایک درخشاں شخصیت نظر آئی جس کا چہرہ سنجیدہ تھا اور جس کی داڑھی سفید تھی (غالباً پیغمبر اسلام کا انھوں نے اسی طرح تصوّر کیا تھا) وہ اُن کے قریب گئے اور ان میں جاذب ہو گئے۔ رام کرشن نے اسلامی خدا کو "صفات رکھنے والے برمھ" کو پا لیا۔ وہاں سے وہ "غیر صفاتی برمھ" تک پہنچے۔ گویا اسلام کی ندی نے انھیں پھر سمندر میں پہنچا دیا۔

سات سال بعد اسی طرح کے ایک دوسرے تجربے سے انھوں نے مسیحیت کو پالیا (میں وضاحت کے لئے واقعات کو ایک ہی جگہ لکھ رہا ہوں) نومبر ۱۸۷۴ء کے قریب ملک نامی کلکتہ کے ایک ہندو نے، جس کا ایک باغ دکشنیشور کے قریب تھا، انھیں انجیل پڑھ کر سنائی۔ رام کرشن پہلی دفعہ مسیح سے ملے۔ تھوڑی ہی دیر بعد الفاظ نے گوشت پوست کا جامہ پہن لیا۔ اور مسیح کی روح خاموشی سے اُن پر چھا گئی۔ ایک دن جب وہ اپنے ایک دولت مند ہندو دوست کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے دیوار پر لگی ہوئی ماں اور بچہ (حضرت مریم اور عیسیٰ) کی تصویر دیکھی۔ تصویر میں جان پڑ گئی۔ اس کے بعد وہی ہوا جو روح کے ناقابلِ تغیّر سفر کے مطابق ہونا چاہیئے تھا۔ مقدس تجلّیاں ان کے قریب آگئیں اور اُن کے اندر اس طرح داخل ہو گئیں کہ اُن کا سارا وجود ان سے بھر گیا۔ ہندو عقائد بہہ گئے۔ لہروں کے درمیان جدوجہد کرتے ہوئے رام کرشن خوفزدہ ہو کر چلّاتے: "ماتا! یہ تم کیا کر رہی ہو؟ میری مدد کرو!" کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ لہروں کی تُندی اپنے سامنے سے سب کچھ بہا لے گئی۔ ہندو روح بدل گئی، اب اس کے اندر مسیح کے سوا کسی کے لئے جگہ نہ تھی۔ کئی دن تک وہ مسیحی خیالات اور مسیحی محبّت کے تصوّرات سے سرشار رہے۔ انھیں مندر جانے کا دھیان نہ رہا۔ پھر ایک دن شام کو انھوں نے دکشنیشور کے ایک باغ میں ایک شخص کو آتے دیکھا جس کی آنکھیں بڑی اور خوبصورت تھیں،

جس کی چال ڈھال میں متانت تھی اور رنگ گورا تھا۔ اگرچہ وہ اس سے ناواقف تھے لیکن اس نامعلوم نووارد کی کشش نے انھیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ اُن کے قریب پہونچ گئے اور انھیں اپنی رُوح کی گہرائیوں میں یہ گیت گاتی ہوئی آواز سُنائی دی: "مسیح کو دیکھو جس نے اپنا خونِ دل دُنیا کی نجات کے لئے بہا دیا، جس نے انسان کی محبت میں بے پایاں کرب جھیلا۔ یہی مکمل یوگی ہے جو خدا سے ابدی طور پر مُتحد ہے۔ یہ عیسٰی مسیح ہے، محبت کا اوتار......"

انسان کے بیٹے (مسیح) نے ہندوستان کے اس عارف، ماتا کے بیٹے کو سینے سے لگا لیا اور اپنے اندر جذب کرلیا۔ رام کرشن پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ایک دفعہ پھر وہ برہمہ سے متحد ہو گئے، پھر آہستہ آہستہ زمین پر واپس آ گئے لیکن اس کے بعد سے وہ مسیح کی الوہیت کو ماننے اور انھیں خدا کا اوتار سمجھنے لگے۔ صرف مسیح ہی نہیں، وہ بدھ اور کرشن کو بھی اوتار مانتے تھے۔

(اِن تمام تجربوں کے بعد ہی) وہ اپنے شاگردوں سے یہ کہہ سکتے تھے:۔

"میں نے ہندو مت، اسلام، مسیحیت ہر مذہب کا تجربہ کیا ہے اور میں ہندو مذہب کے مختلف فرقوں کی راہ پر بھی چلا ہوں .... میں نے تو یہی پایا کہ خدا ایک ہی ہے جس کی جانب سب قدم بڑھا رہے ہیں اگرچہ راہیں مختلف ہیں۔ تمھیں ہر عقیدے کو آزمانا اور ایک بار ہر راستے پر چلنا چاہئے۔ میں جدھر دیکھتا ہوں لوگ مذہب کے نام پر لڑ رہے ہیں، ان میں ہندو، مسلمان، برہمو، ویشنو اور سبھی ہیں۔ یہ لوگ کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ وہ جس کا نام کرشن ہے، وہی شیو کہلاتا ہے، اُسی کا نام قوّتِ اُولیٰ، مسیح اور اللّٰہ بھی ہے، ہزاروں ناموں کے ساتھ وہی رام بھی ہے۔ اس تالاب کے بہت سے گھاٹ ہیں۔ ایک گھاٹ پر ہندو اپنا گھڑا بھر رہا ہے اور اسے "جل" کے نام سے پکارتا ہے۔ دوسرے پر مسلمان اپنی چرمی مشک بھر رہا ہے اور اسے "پانی" سے موسوم کرتا ہے اور تیسرے پر عیسائی ہے جو اُسے "واٹر" کہتا ہے۔ کیا ہم یہ سوچ سکتے ہیں

کو "واٹر" "جل" نہیں ہے، صرف "پانی" یا "واٹر" ہے؟ یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہوگی! مختلف ناموں کے باوجود اصل ایک ہی ہے اور ہر شخص اسی اصل کی تلاش میں ہے، صرف موسم، مزاج اور نام بدلتے ہیں۔ ہر شخص کو اپنی راہ اختیار کرنے کا حق ہے۔ اگر وہ خلوص اور لگن سے خدا کو حاصل کرنا چاہتا ہے، اُس پر رحمت ہو! وہ یقیناً اُسے پالے گا۔"

رام کرشن اپنے شاگردوں کو کیا تعلیم دیتے تھے؟ وویکانند نے خاص کر اُس وقت کے ہندوستان میں اُن کے طریق کار کی ندرت پر زور دیا ہے۔ اس کے بعد اُن کے بعض تعلیمی اصول یورپ کے بعض مکاتب تعلیم میں سمو کر نئے سر سے مرتب کر لئے گئے ہیں۔ اس وقت تک ہندوستان میں گرو کے الفاظ قانون کی حیثیت رکھتے تھے۔ گرو اپنے چیلوں سے اس سے زیادہ احترام کا مطالبہ کرتا تھا جتنا وہ اپنے والدین کا کرتے تھے۔ رام کرشن اس کو بالکل ناپسند کرتے تھے وہ خود کو اپنے نوجوان چیلوں کے ساتھ ایک ہی سطح پر رکھتے تھے۔ وہ ان کے ساتھی اور ان کے بھائی تھے، اُن سے بے تکلفی سے اس طرح باتیں کرتے تھے کہ اُن میں برتری کا شائبہ کبھی نہیں ہوتا تھا۔

اس طرح یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گرو کی حیثیت سے وہ اس بات کا بہت خیال رکھتے تھے کہ سورج اور ان انسانی پودوں کے درمیان اپنے کو حائل کر کے اُن کی نشو و نما کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالیں۔ دوسروں کی شخصیت کا احترام اور ان کی محبت اندا سے اپنا گرویدہ بنانے کا خوف، اُن کے دل میں اس قدر تھا کہ وہ لوگوں سے بہت زیادہ محبت کرنے سے بھی ڈرتے تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ شاگردوں کی رقیق القلبی انھیں ان کا گرفتار بنا دے۔ (وہ کہتے تھے کہ "شہد کی مکھیوں کو اپنے دل کا رس چوسنے دو، لیکن اس بات کا خیال رکھو کہ تمھارے دل کی خوبصورتی اُن میں سے کسی کو تمھارا قیدی نہ بنا لے۔" اپنے خیالات اُن پر مسلط کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں مذہب یا مابعد الطبیعات کے متعلق بے نتیجہ بحثیں کبھی نہیں ہوتی تھیں۔

(وہ کہتے تھے) "مجھے بحث مباحثہ پسند نہیں۔ خدا دلائل کی حد سے باہر ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جو کچھ وجود میں آگیا ہے وہ خدا ہے، پھر دلیلیں لانے سے فائدہ؟ باغ میں جاؤ، خوش ذائقہ آم کھاؤ اور چلے آؤ! تم وہاں اس لئے نہیں جاتے کہ آم کے درخت کی پتیاں گنو۔ پھر تناسخ اور بت پرستی کے متعلق بحث کر کے وقت ضائع کرنے سے فائدہ؟"

پھر کس چیز کی کوئی اہمیت ہے؟ ذاتی تجربے کی۔ پہلے تجربہ کرلو تب خدا پر یقین لاؤ۔ یقین مذہبی اور روحانی تجربے کے بعد ہونا چاہئے، پہلے نہیں۔ اگر پہلے ہی آجاتے تو متناقض ہوگا۔

رام کرشن کے لئے نکوکاری کا مطلب کم سے کم یہ تھا کہ خدا کے تمام بندوں سے محبت کی جائے کیونکہ خدا انسانوں ہی میں اوتار لیتا ہے۔ کوئی شخص درحقیقت انسان سے محبت نہیں کرسکتا اس لئے کوئی اس کی مدد بھی اس وقت تک نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ انسان کے اندر والے خدا کی محبت نہیں کرتا۔ یہ نتیجہ صریح بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص خدا کو اس وقت تک نہیں جان سکتا جب تک کہ اس نے اُسے انسان کے اندر نہیں دیکھا ہے۔

لیکن اس وقت تو انسان مصائب میں مبتلا ہے، انسانیت ختم ہو رہی ہے، اسے بالکل چھوڑ دیا گیا ہے۔ کیا اِسے کسی سہارے کے بغیر چھوڑ دینا چاہئے؟ ہرگز نہیں! جو کام رام کرشن کبھی پورا نہ کرسکے، اور جو درحقیقت اپنے کرم اور زندگی کے محدود دائرے کے اندر وہ پورا کر بھی نہیں سکتے تھے (اور اب تو وہ زندگی اپنے خاتمہ کے قریب بھی پہونچ رہی تھی) وہ انھوں نے اپنے عظیم المرتبت شاگرد اور اپنے خیالات کے وارث وویکانند کے لئے چھوڑ دیا۔ یہ وہ شخص تھا جسے انسانوں کے درمیان سے انسانوں ہی کی مہمات کے لئے منتخب کرنا اُن کا خاص مشن تھا۔ باوجودیکہ وہ اس کے لئے پوری طرح تیار نہ تھا لیکن انھوں نے دُنیا میں یہ کام کرنے اور "غریبوں اور بیکسوں کی تکالیف مٹانے" کا کام اُسے سونپ دیا۔

رام کرشن اپنے خیالات کو ہر شاگرد کی رسائی ذہن کے مطابق بنا سکتے تھے اور انسانی روح کے نازک توازن کو درہم برہم کرنے کی بات تو دور رہی، وہ اس بات کا بھی خیال رکھتے تھے کہ جن عناصر سے اس کا ذہن بنا ہے اُن میں بڑی نزاکت سے آہستہ آہستہ اضافہ کیا جائے۔ وہ مزاج کو دیکھ کر اپنا طریقِ کار بدل سکتے تھے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ متضاد خیالات کے حامل نظر آتے تھے۔

یہ خیال ہو سکتا تھا کہ ایک ایسا شخص جو وجودِ مطلق سے متصل ربط رکھتا ہے اور روزمرہ کی زندگی کے عام معیاروں سے دور رہے، اس میں اس کی اہلیت نہ ہوگی کہ وہ روزانہ کی عملی زندگی کے ہزارہا نازک معاملات کو سمجھ اور برت سکے لیکن رام کرشن پرم ہنس کا معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ مایا کی زنجیروں سے اُن کی آزادی نے سب سے پہلے تو اُنہی آنکھوں پر سے تعصب، کٹرپن، تنگ دلی اور تنگ نظری کے پردے ہٹا دئے تھے اور اب چونکہ ان کی آزاد معاملت میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں رہ گئی تھی اس لئے وہ ہر چیز اور ہر شخص کو خندہ پیشانی اور نیک خیالی سے پرکھتے تھے۔ اُن کا سقراط کے انداز کا مباحثہ آج کے سننے والوں کو عجیب معلوم ہوتا۔ یہ بحثیں مسیح کے مقابلے میں مان تین اور اریس مس سے زیادہ قریب ہیں۔ اُن کے طنزیہ ہیر پھیر اور شگفتہ جملے فرحت بخش اثر رکھتے ہیں۔ بنگال کے پُرجوش ماحول نے ان جلد متاثر ہو جانے والے ذہنوں کے لئے ان کی دلکشی میں اضافہ کر دیا ہوگا۔ اس جگہ میں اُن کی دو دلچسپ مثالیں دوں گا۔ ان میں سے ایک تو "ہاتھی" کی تمثیل ہے دوسری "سانپ" کی۔ پہلی میں رام کرشن نے ایک دلچسپ طنزیہ کے ذریعہ اپنے شاگردوں کو اس بات سے متنبہ کیا ہے کہ وہ تشدد اور مکمل عدم مقاومت کی متضاد انتہا پسندیوں سے بچیں اور دوسری میں اپنے ہی اوپر طنز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے بڑھتی ہوئی بے عملی اور خیر و شر سے بےتعلقی

سے خطرات کا گہرا مطالعہ کیا تھا جن کا اثر نوجوان دماغوں پر حاضر و ناظر خدا کے وجود کی حرارت کا پڑتا تھا اور وہ ہم میں اور ہمارے گرد و پیش اس کی موجودگی کے درجوں اور اس کے قوانین کے مدارج کو تفریحی انداز میں دیکھتے تھے۔

ہاتھی

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی جنگل میں ایک پاک نہاد شخص رہتا تھا، اُس کے بہت سے چیلے تھے۔ ایک دن اُس نے انھیں یہ تلقین کی: خدا ہر چیز میں ہے اس لئے ہمیں اپنا سر جذبۂ پرستش کے ساتھ ہر چیز کے سامنے جھکا دینا چاہئے۔ اتفاق سے ایک شاگرد پوجا پاٹ کی آگ روشن کرنے کے لئے جنگل سے لکڑیاں اکٹھا کرنے گیا، اُسے اچانک یہ شور سنائی دیا، 'بھاگو بھاگو! ایک پاگل ہاتھی آ رہا ہے!' یہ سنتے ہی اس شاگرد کے سوا تمام لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے ذہن میں یہ خیالات تھے کہ ہاتھی بھی خدا ہی کی ایک شکل ہے، پھر میں اس سے کیوں بھاگوں؟ اس لئے وہ وہیں کھڑا رہا اور جب ہاتھی اُدھر آیا تو اس نے جھک کر اُس کو سلام کیا اور اس کی تعریف کے گیت گانے لگا۔ ہاتھی کا مہاوت چلّایا، 'اپنے کو بچاؤ! اپنے کو بچاؤ!' لیکن شاگرد ایک قدم بھی نہ ہٹا۔ ہاتھی نے اُسے اپنی سونڈ میں لپیٹ کر بہت دور پھینک دیا۔ بیچارہ بدقسمت انسان حیرت زدہ اور ساکت رہا۔ اس کے چوٹ آئی اور خون بہنے لگا۔ جب گرو کو یہ خبر ملی تو وہ اور لوگوں کو ساتھ لے کر وہاں پہنچا۔ وہ لوگ اُسے اٹھا کر گھر لائے اور اس کی مرہم پٹی کی۔ جب اُسے ہوش آیا تو اُن لوگوں نے پوچھا: "جب ہاتھی بان نے تم سے چیخ کر بچنے کو کہا تھا تو تم نے اپنے کو بچایا کیوں نہیں؟" نوجوان چیلے نے جواب دیا "گرو نے تو ابھی یہ کہا تھا کہ خدا ہر شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ میں نے اس ہاتھی کو خدا سمجھا، اس لئے اپنی جگہ سے نہیں ہٹا۔" گرو نے اس سے کہا: "میرے بیٹے! یہ سچ ہے وہ ہاتھی دیوتا تھا

جو تم نے دیکھا لیکن کیا ہاتھی بان دیوتا نے تم سے بچ جانے کے لئے نہیں کہا تھا؟ یہ صحیح ہے کہ خدا خود کو ہر شکل میں ظاہر کرتا ہے لیکن کیا اگر وہ ہاتھی میں ظاہر ہو سکتا ہے تو ہاتھی بان میں ظاہر نہیں ہو سکتا؟ اب مجھے بتاؤ کہ تم نے اس کی بات کیوں نہ مانی؟......"

اور اب دیکھئے ایک اور دلچسپ گفتگو کا خلاصہ جو رام کرشن اور نوجوان وویکانند کے درمیان ہوئی۔

سانپ

گرو۔ (مسکراتے ہوئے) "نریندر! تمھارا کیا خیال ہے، جو لوگ دُنیا کے بندے ہیں وہ اکثر اُن لوگوں کے متعلق بہت تلخ باتیں کہتے ہیں جو خدا سے لَو لگائے ہُوئے ہیں؟ جب سڑک پر ایک ہاتھی گذرتا ہے، کتّوں اور دوسرے جانوروں کا ایک جھنڈ اس کے پیچھے بھونکتا اور منھ مارنے کی کوشش کرتا چلتا ہے لیکن وہ اُن سے بے پروا اپنے راستے پر چلتا چلا جاتا ہے۔ بیٹا! اگر لوگ تمھاری پیٹھ پیچھے تمھیں بُرا بھلا کہیں تو تم کیا کرو گے؟

نریندر۔ (حقارت سے) "میں اُن کو سڑک کے وہی کتے سمجھوں گا جو میرے پیچھے بھونکتے چل رہے ہیں"۔

گرو۔ (ہنس کر) "نہیں بیٹا! تمھیں اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں۔ یاد رکھو کہ خدا ہر جاندار اور غیر جاندار میں بستا ہے۔ اس لئے تمام چیزیں ہمارے احترام کی مستحق ہیں...... انسانوں کے ساتھ اپنے تعلّقات میں بس یہی کر سکتے ہیں کہ اچھے لوگوں سے رابطہ رکھیں اور بُرے لوگوں سے بچیں۔ یہ صحیح ہے کہ خدا شیر میں بھی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہم اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور اسے اپنے سینے سے لگا لیں"۔ (سب شاگرد ہنسنے لگتے ہیں)

سے خطرات کا گہرا مطالعہ کیا تھا جن کا اثر نوجوان دماغوں پر حاضر و ناظر خدا کے وجود کی حرارت کا پڑتا تھا اور وہ ہم میں اور ہمارے گرد و پیش اس کی موجودگی کے درجوں اور اس کے قوانین کے مدارج کو تفریحی انداز میں دیکھتے تھے۔

ہاتھی

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی جنگل میں ایک پاک نہاد شخص رہتا تھا، اُس کے بہت سے چیلے تھے۔ ایک دن اُس نے انھیں یہ تلقین کی: خدا ہر چیز میں ہے اس لئے ہمیں اپنا سر جذبۂ پرستش کے ساتھ ہر چیز کے سامنے جھکا دینا چاہئے۔ اتفاق سے ایک شاگرد پوجا پاٹ کی آگ روشن کرنے کے لئے جنگل سے لکڑیاں اکٹھا کرنے گیا، اُسے اچانک یہ شور سُنائی دیا، بھاگو بھاگو! ایک پاگل ہاتھی آرہا ہے! یہ سُنتے ہی اس شاگرد کے سوا تمام لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے ذہن میں یہ خیالات تھے کہ ہاتھی بھی خدا ہی کی ایک شکل ہے، پھر میں اس سے کیوں بھاگوں؟ اس لئے وہ وہیں کھڑا رہا اور جب ہاتھی اُدھر آیا تو اس نے جُھک کر اس کو سلام کیا اور اس کی تعریف کے گیت گانے لگا۔ ہاتھی کا مہاوت چلاّیا، اپنے کو بچاؤ! اپنے کو بچاؤ! لیکن شاگرد ایک قدم بھی نہ ہٹا۔ ہاتھی نے اُسے اپنی سونڈ میں لپیٹ کر بہت دُور پھینک دیا۔ بیچارہ بدقسمت انسان حیرت زدہ اور ساکت رہا۔ اس کے چوٹ آئی اور خون بہنے لگا۔ جب گرو کو یہ خبر ملی تو وہ اور لوگوں کو ساتھ لے کر وہاں پہنچا۔ وہ لوگ اُسے اٹھا کر گھر لائے اور اس کی مرہم پٹی کی۔ جب اُسے ہوش آیا تو اُن لوگوں نے پوچھا: "جب ہاتھی بان نے تم سے چیخ کر بچنے کو کہا تھا تو تم نے اپنے کو بچایا کیوں نہیں؟" نوجوان چیلے نے جواب دیا "گرو نے تو ابھی یہ کہا تھا کہ خدا ہر شکل میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ میں نے اس ہاتھی کو خدا سمجھا، اس لئے اپنی جگہ سے نہیں ہٹا۔" گرو نے اس سے کہا: "میرے بیٹے! یہ سچ ہے وہ ہاتھی دیوتا تھا

جو تم نے دیکھا لیکن کیا ہاتھی بان دیوتا نے تم سے بچ جانے کے لئے نہیں کہا تھا؟ یہ صحیح ہے کہ خدا خود کو ہر شکل میں ظاہر کرتا ہے لیکن کیا، اگر وہ ہاتھی میں ظاہر ہو سکتا ہے تو ہاتھی بان میں ظاہر نہیں ہو سکتا؟ اب مجھے بتاؤ کہ تم نے اس کی بات کیوں نہ مانی؟........"

اور اب دیکھئے ایک اور دلچسپ گفتگو کا خلاصہ جو رام کرشن اور نوجوان وویکانند کے درمیان ہوئی۔

سانپ

گرو:۔ (مسکراتے ہوئے) نریندر! تمھارا کیا خیال ہے، جو لوگ دُنیا کے بندے ہیں وہ اکثر اُن لوگوں کے متعلق بہت تلخ باتیں کہتے ہیں جو خدا سے لَو لگاتے ہُوئے ہیں؟ جب سڑک پر ایک ہاتھی گذرتا ہے، کتّوں اور دوسرے جانوروں کا ایک جھنڈ اس کے پیچھے بھونکتا اور منھ مارنے کی کوشش کرتا چلتا ہے لیکن وہ اُن سے بے پروا اپنے راستے پر چلتا چلا جاتا ہے۔ بیٹا! اگر لوگ تمھاری پیٹھ پیچھے تمھیں بُرا بھلا کہیں تو تم کیا کرو گے؟

نریندر:۔ (حقارت سے) میں اُن کو سڑک کے وہی کتّے سمجھوں گا جو میرے پیچھے بھونکتے چل رہے ہیں"

گرو:۔ (ہنس کر) "نہیں بیٹا! تمھیں اتنی دُور بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ یاد رکھو کہ خدا ہر جاندار اور غیر جاندار میں بستا ہے۔ اس لئے تمام چیزیں ہمارے احترام کی مُستحق ہیں.... انسانوں کے ساتھ اپنے تعلّقات میں بس یہی کر سکتے ہیں کہ اچھے لوگوں سے رابطہ رکھیں اور بُرے لوگوں سے بچیں۔ یہ صحیح ہے کہ خدا شیر میں بھی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہم اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں اور اسے اپنے سینے سے لگا لیں؛ (سب شاگرد ہنسنے لگتے ہیں)

نریندر:- تو کیا جب بدمعاش ہمیں ذلیل کریں تو ہم چُپ رہیں؟

گرو:- ایک زمانے کی بات ہے کہ کچھ چرواہے ایک چراگاہ میں اپنے جانور چرایا کرتے تھے۔ اسی میدان میں ایک خطرناک زہریلا سانپ رہتا تھا۔ ایک دن اُدھر سے ایک خدارسیدہ بزرگ کا گزر ہوا۔ لڑکے دوڑ کر اس کے پاس آئے اور کہا: "بابا! اس راستے پر نہ جانا، ادھر ایک سانپ رہتا ہے"۔ سادھو نے جواب دیا: "بچو! میں تمہارے سانپ سے نہیں ڈرتا۔ میں ایسے منتر جانتا ہوں جو میری حفاظت کریں گے"۔ یہ کہہ کر وہ اپنے راستے پر آگے بڑھا...... سانپ نے اُسے دیکھا تو پھن اُٹھا کر سامنے آ گیا۔ سادھو نے ایک منتر جپا اور سانپ اس کے قدموں پر اس طرح گر پڑا جیسے کیچوا۔ سادھو نے سانپ سے کہا: "بتاؤ تم یہ دوسروں کو تکلیف کیوں دیتے ہو؟ میں تمھیں خدا کا ایک مقدس نام بتائے دیتا ہوں اُس کا یہ ورد کیا کرو، پھر تمھیں خدا سے محبت کرنا آ جائے گا۔ آخر میں تم اُسے دیکھ بھی لو گے اور تمھاری دوسروں کو نقصان پہنچانے کی خواہش بھی ختم ہو جائے گی"۔ سادھو نے سانپ کے کان میں خدا کا وہ نام بتا دیا۔ سانپ نے سر جھکایا اور کہا: "بابا! یہ بھی تو بتائیے کہ مجھے اپنی حفاظت کے لئے کیا کرنا چاہئے؟" سادھو نے جواب دیا: "یہی پاک نام لئے جاؤ اور کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ! میں پھر آؤں گا اور دیکھوں گا کہ تم کیا کر رہے ہو"۔ یہ کہہ کر سادھو چلا گیا...... دن گزرتے گئے۔ جانور چرانے والے لڑکوں نے دیکھا کہ سانپ اب کسی کو نہیں کاٹتا۔ وہ اُسے پتھر مارنے لگے لیکن اب وہ اس طرح خاموش اور بے ضرر ہو گیا تھا جیسے کیچوا۔ ایک شریر لڑکے نے اُسے دُم سے پکڑ لیا اور اپنے سر کے گرد گھما کر کئی بار اُسے پتھر پر پٹکا۔ سانپ کے مُنھ سے خون نکل پڑا اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ مر گیا۔ رات کو اُسے ہوش آیا۔ آہستہ آہستہ

وہ اپنی بل تک گیا، اُس کا بدن چور چور ہو گیا تھا۔ چند دنوں کے بعد بس وہ ایک ڈھانچہ سا رہ گیا اور کئی روز بعد اِس قابل ہوا کہ رینگ کر جاتے اور اپنے کچھ کھانے کی فکر کرے۔ لڑکوں کے ڈر سے وہ صرف رات کے وقت نکلتا تھا۔ برہمن کی ہدایت کے بعد سے اس نے کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ جب حد تک بن پڑتا تھا وہ گھاس پات کھا کر اپنا پیٹ پالتا۔

سادھو کچھ دنوں کے بعد لوٹا۔ اس نے سانپ کو چاروں طرف تلاش کیا۔ لڑکوں نے کہا کہ وہ مر گیا۔ برہمن کو تعجّب ہوا کیونکہ خدا کا وہ نام جو سانپ کے وردِ زبان تھا اس کی زندگی کا اس وقت تک کے لئے ضامن تھا جب تک کہ اس کا مقصد پورا نہ ہو جائے یعنی جب تک وہ خدا کا دیدار نہ کر لے۔ اس نے اپنی تلاش جاری رکھی اور اس کا نام لے کر کئی بار آواز دی۔ سانپ اپنی بِل سے باہر نکلا اور گرو کو جھک کر سلام کیا۔ پھر اُن کے درمیان یہ باتیں ہوئیں :۔

سادھو :۔ ’کہو تم کیسے ہو؟‘

سانپ :۔ ’بابا! آپ کا شکریہ! خدا کے فضل سے میں بالکل ٹھیک ہوں‘۔

سادھو :۔ ’پھر یہ کیا بات ہے کہ تم بالکل ہڈی اور چمڑا رہ گئے ہو؟ تمھیں ہو کیا گیا ہے؟‘

سانپ :۔ ’آپ کے حکم کی تعمیل میں میں نے اس بات کی کوشش کی کہ کسی جاندار کو تکلیف نہ پہونچاؤں میں پتّیاں اور ایسی ہی چیزیں کھا کر جی رہا ہوں۔ اِس لئے ممکن ہے کہ میں لاغر ہو گیا ہوں‘۔

سادھو :۔ ’نہیں، میرا خیال ہے کہ یہ محض کھانے پینے کی تبدیلی نہیں ہے جس نے تمھاری یہ حالت بنا دی ہے۔ کوئی اور بات ضرور ہوئی ہے۔ مجھے وہ بات بتاؤ!‘

سانپ:۔ "اوہ !........ ہاں شاید .... ٹھیک ہے اب مجھے یاد آیا۔ ایک دن اُن چرواہے لڑکوں نے میرے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا۔ انھوں نے مجھے دُم سے پکڑ لیا اور کتنی بار زور زور سے پتھّر پر پٹکا۔ اُن بیچاروں کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ مجھ میں کتنی تبدیلی ہو گئی ہے' اور وہ جان بھی کیسے سکتے تھے کہ میں نے کاٹنا چھوڑ دیا ہے"۔

سادھو:۔ "لیکن یہ تو بالکل پاگل پن ہے۔ سراسر پاگل پن! تم بالکل احمق ہو۔ اگر تم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ دشمنوں کو اس طرح نقصان پہنچانے سے روک سکو ..... میں نے تمھیں جس بات سے منع کیا تھا وہ تو یہ تھی کہ خدا کی کسی مخلوق کو کاٹو مت۔ تم نے انھیں پھنکار کر ڈرایا کیوں نہیں جو تمھیں مار ڈالنا چاہتے تھے؟'

اور یہ کہہ کر رام کرشن نے آنکھ مار کر اپنے شاگردوں کی طرف دیکھا۔ "اسی طرح اپنے پھن اُٹھاؤ ...... مگر کاٹو نہیں ...... جو شخص سماج میں رہتا ہے اور خاص طور سے اگر وہ شہری ہے یا خاندان کا بزرگ ہے تو اُسے خود کو تکلیفوں سے بچانے کا کوئی بہانہ نکالنا چاہیئے لیکن اُسے اس بات کا بہت خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ بُرائی کے بدلے بُرائی نہ کرے"۔

———:(۹):———

محبُوب شاگرد — نرِن

اونچی درجے کے ہندوستانی شاگردوں میں، جنھوں نے اپنے عقیدے اور عمل سے بعد میں امتیاز حاصل کیا، ایک مخصوص شاگرد تھا جس کے ساتھ رام کرشن کا برتاؤ بھی مخصوص تھا۔ انھوں نے اس کا انتخاب پہلی ہی نظر میں اس وقت کر لیا تھا جب وہ ان سے واقف بھی نہیں تھا اور اسی وجہ سے کیا تھا جو وہ تھا اور جو آگے ہونے والا تھا یعنی عالمِ انسانی کا رہنما۔ اس کا نام تھا نرین درناتھ دت، ودیکانند۔

یہاں پر میں اُن کے حسین رُوحانی کشف کا تذکرہ کروں گا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک عام انداز میں اس کا تذکرہ اِس طرح کر سکتا ہوں جیسے کوئی ماہرِ نفسیات کرے گا لیکن ایسی توضیح و تشریح بیکار ہوگی۔ ہمیں معلوم ہے کہ ایک زبردست کشفی تجربہ اس کی تخلیق کر سکتا ہے جو کچھ اس نے دیکھا ہے۔ زیادہ گہرے مفہوم میں بعد کے پیغامبر ہی ان سچائیوں کے اصل خالق ہیں جو ساحلِ وجود پر ٹھہر رہی تھیں لیکن ابھی وجود میں نہیں آئی تھیں۔ وہ طوفانی لہریں جو ودیکانند کے مستقبل کی تشکیل کر رہی تھیں، زمین کی گود میں کھو جاتیں اگر رام کرشن کی نگاہوں نے انھیں دیکھا نہ ہوتا اور گویا تیشہ کے ایک ہی وار سے اس چٹان

میں شگاف نہ ڈال دیا ہوتا جوان کا راستہ روک رہی تھی۔ اس شگاف نے اُن کی رُوح کے دریا کو بہنے کا موقع دیا۔

(رام کرشن کا بیان ہے کہ) "ایک دن میں نے ایسا محسوس کیا کہ مراقبہ کے عالم میں میرا ذہن ایک روشن راستہ پر اُڑتا چلا جا رہا ہے۔ ذرا سی دیر میں اس نے ستاروں کی دُنیا کو پار کر لیا اور تصوّرات کی لطیف تر دنیا میں داخل ہو گیا۔ یہ جس قدر بلند سے بلند تر ہوتا جاتا تھا میں دیکھتا تھا کہ راستے کے دونوں طرف دیویوں اور دیوتاؤں کے مثالی پیکر نظر آ رہے ہیں۔ اس کے بعد ذہن اس علاقے کی بیرونی حدوں کے پاس پہونچ گیا جہاں ایک روشن دیوار اضافی وجود کی دُنیا اور وجود مطلق کے درمیان حائل تھی۔ اس دیوار کو عبور کر کے ذہن ماورائی دنیا میں داخل ہو گیا جہاں کوئی مادّی وجود نظر نہ آتا تھا۔ دیوتا تک اس کی جرأت نہیں کر سکتے تھے کہ اس دنیا کی طرف دیکھیں، وہ بہت نیچے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہنے پر قانع تھے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں میری نظر سات محترم عارفوں پر پڑی جو مراقبے کی حالت میں بیٹھے تھے۔ میرے دل نے کہا کہ یہ عارفانِ رّبانی اپنے علم اور تقدس، تیاگ اور عشقِ خدا میں نہ صرف انسانوں بلکہ دیوتاؤں سے بھی بڑھے ہوئے ہونگے۔ میں اس خیال میں کھویا ہوا ان کی عظمتوں پر غور کر رہی رہا تھا کہ میں نے دیکھا اس غیر ممیّز روشن خطّے کا ایک ٹکڑا سُکڑ کر ایک چھوٹا سا ربّانی بچّہ بن گیا۔ وہ بچّہ ان سات بزرگوں میں سے ایک کے پاس آیا اور اپنی خوبصورت باہیں نرمی سے اس کے گلے میں حائل کر دیں پھر بڑی دلکش آواز میں اُن سے مخاطب ہو کر انھیں مراقبے کی حالت سے علیحدہ کرنا چاہا۔ اس کے ساحرانہ لمس نے اس عارفِ ربّانی کو اپنی اس شعور سے بھی بالاتر حالت سے چونکا دیا اور انھوں نے اپنی نیم وا آنکھوں سے اس عجیب و غریب بچّے کو دیکھا۔ اُن کے نکلتے ہوئے

چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ بچہ ان کا سرمایۂ حیات ہے۔ بچے نے بڑی مسرت بخش آواز میں ان سے کہا: میں نیچے جا رہا ہوں آپ کو بھی میرے ساتھ چلنا چاہیئے' وہ خاموش رہے لیکن ان کی نرم نگاہیں ان کے رضامند ہونے کا پتہ دیتی تھی۔ بچے کو غور سے دیکھتے دیکھتے وہ پھر سمادھی (مراقبہ) میں پہونچ گئے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُن کے جسم و دماغ کا ایک ٹکڑا ایک چمکدار روشنی کی شکل میں نیچے اُترنے لگا میں نے جیسے ہی نریندر (وویکانند) کو دیکھا پہچان لیا کہ یہ وہی عارفِ ربانی ہے۔"

ان کی رائے درست تھی۔ انھیں ایک مضبوط جسم کی ضرورت تھی' ایسے بازوؤں کی جو زمین کے طبق پلٹ دیں' ایسے پیروں کی جو اس پر چلیں، کام کرنے والوں کے ایک محافظ کی اور ان پر حاکمانہ اقتدار رکھنے والے دماغ کی اور ایک ایسے دل کی جس میں ساری دُنیا کی محبت بھری ہوئی ہو۔ ان کے زبردست یقین نے اس سرزمین سے اسے حاصل کر لیا یہ صرف ان کی دُوربینی اور قوتِ ارادی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ اس کا بھی کہ سرزمینِ بنگال اُن کی پکار پر لبیک کہنے کے لیئے ہمہ تن تیار تھی۔ خود فطرت کی بچہ جننے کی صلاحیت نے وویکانند کو اس "ضاری" میں پیش کر دیا کیونکہ اس طرح کی روح کی زچگی کا زمانہ آ گیا تھا۔

رام کرشن کی تعریف اس لیئے بھی ہونی چاہیئے کہ انھوں نے بیک نظر نریندر کے اندر جو اس وقت بھٹکے ہوئے' پریشان اور طوفان زدہ تھے مستقبل کے رہنما اور اپنے خیال کے مبلّغ کو دیکھ لیا۔

ان کی پہلی ملاقات کی داستان تفصیل سے کہے جانے کی چیز ہے۔ اس وقت پڑھنے والے کو وہی تجربہ ہوگا جو نرتن (نریندر) کو اپنے کو دُور رکھنے کے باوجود ہوا اور بچنے کے باوجود اس گرو سے مل جانے میں ہوا جس نے انھیں منتخب کر لیا تھا۔ لیکن پہلے ہمیں

اس نوجوان نابغہ کی اُس وقت کی تصویر پیش کرنا چاہئے جب اس کا شہاب ثاقب رام کرشن کے مدار میں داخل ہو کر اسی میں جذب ہو گیا۔

وہ ایک بہت بڑے رئیس چھتری خاندان کے ایک فرد تھے اور ان کی پوری زندگی اس بہادر قوم کے انداز کی مظہر تھی۔ وہ ۱۲ جنوری ۱۸۶۳ئ کو کلکتہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی ماں ایک شاہانہ شان رکھنے والی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھیں جن کی دلیرانہ روح عظیم الشان ہندو مذہبی نظموں کے سایہ میں پروان چڑھی تھی۔ ان کے والد جو کسی قدر پُر شکوہ اور مضطرب زندگی گذارتے تھے، ایسی آزادگی پسندی کا اظہار کرتے تھے جو وا کیٹر کا انداز رکھتی تھی یا اٹھارھویں صدی کے کسی بڑے فرانسیسی رئیس سے ملتی جلتی تھی۔ کچھ تو زبردست انسان دوستی کے جذبات کی وجہ سے اور کچھ اپنی برتری کے خوشگوار احساس کے سبب' وہ ذات پات کے تفرقوں سے بے پروا تھے۔ لیکن ان کے دادا جو ایک دولتمند اور مہذب انسان تھے، ایک اعلیٰ عہدہ، دولت، مجلسی زندگی اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر پچیس ہی سال کی عمر میں سنیاسی بننے کے لئے جنگلوں میں چلے گئے تھے۔ اس کے بعد وہ کبھی دیکھے نہیں گئے.....

اُن کا بچپن اور لڑکپن دونوں نشاۃ الثانیہ کے ایک فنکار شہزادے کی طرح گذرے۔ انھیں قدرت نے بہت سی صلاحیتیں عطا کی تھیں اور انھوں نے ان سب کی آبیاری کی تھی۔ اُن کا حسن شیرانہ تھا اور انداز کی نرمی ہرن کے بچے جیسی تھی۔ ان میں جرأت تھی، جسمانی ساخت ایک ورزشی کی تھی اور وہ ہر طرح کے ورزشی کھیل میں ماہر تھے۔ وہ پیرتے، مُکّا بازی کرتے، کشتی چلاتے تھے اور شہسواری کا زبردست شوق رکھتے تھے وہ نوجوانوں میں بے حد مقبول تھے اور فیشن کے معاملات میں ان کی رائے فیصلہ کن ہوتی تھی۔ وہ مذہبی رقص بڑی مہارت سے کرتے تھے اور ایسی دلکش آواز کے مالک تھے جو

بعد میں رام کرشن کو مسحور کر لیتے والی تھی۔ انھوں نے گانے اور ساز بجانے کی تعلیم چار پانچ سال تک ہندو اور مسلمان اُستادوں سے حاصل کی تھی۔ وہ دھنوں کو تحریری شکل دیتے اور انھوں نے ہندوستانی موسیقی کے فلسفہ اور علم پر ایک محققانہ مضمون لکھا تھا حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر حلقہ میں موسیقی کے مسلم الثبوت استاد سمجھے جاتے تھے۔ ان کے لئے موسیقی ہی مندر میں داخلہ کا راستہ اور ایوانِ خداوندی تک پہنچنے کی دہلیز تھی۔ کالج میں انھیں اپنی ذہانت کی وجہ سے امتیاز حاصل تھا۔ ان کے مطالعہ کے دائرے میں سائنس، ہیئت، ریاضیات، فلسفہ، ہندوستانی اور مغربی زبانیں، سب ہی یکساں لگن کے ساتھ شامل تھیں۔ وہ سنسکرت اور انگریزی شعراء کو پڑھتے رہتے تھے۔ گبن اور گروٹ کی تاریخی تصانیف کو انھوں نے چاٹ ڈالا تھا۔ انقلاب فرانس اور نپولین نے ان کے جذبات کو بھڑکایا تھا۔ ہندوستان کے اکثر بچوں کی طرح بچپن ہی سے انھوں نے غور و فکر کی عادت ڈالی تھی۔ راتوں کو وہ دِی اِمی ٹیشن آف جیزس کرائسٹ اور ویدانت پڑھنے میں غرق رہتے۔ انھیں فلسفیانہ بحث و مباحثہ سے دلچسپی تھی۔ استدلال، تنقید، چھان بین کا یہی جنون تھا جس نے انھیں بعد میں وویکانند کا لقب عطا کیا۔ وہ یونانی حسن اور ہند جرمانی افکار کو سمو کر ایک وحدت میں ڈھالنے کی کوشش کرتے۔ لیکن ان کی آفاقیت میں، جس نے زندگی کی ہر شکل پر روحانی حکومت کے ذریعہ لیونارڈو اور البرٹی کا معیار حاصل کر لیا تھا، مذہبی روح اور مطلق سچائی کا امتزاج بھی تھا۔ خوبصورت نوجوان نے، جسے زندگی کی تمام اچھی چیزیں اور لطف حاصل تھے، آزاد اور پر شوق ہونے کے باوجود اپنے اوپر مذہبی پاکیزگی کی قید لگالی تھی۔ کسی فرقہ سے وابستہ ہوئے بغیر اور کسی عقیدے کو اختیار کرنے سے پہلے، انھیں اس بات کا احساس تھا کہ جسم اور روح کی پاکیزگی ایک روحانی طاقت رکھتی ہے جس کی آگ زندگی کے ہر پہلو میں داخل ہو جاتی ہے لیکن

معمولی نجاست یا آلودگی سے مجھ جاتی ہے۔ اس کے گہرے اسباب ہیں بعد میں بحث کروں گا
اس کے علاوہ وہ ایک زبردست مقدّر کے امین تھے اور اگرچہ وہ ابھی اس کی سمت سے
واقف نہیں تھے لیکن خود کو اس کے قابل بنانا اور اسے حاصل کرنا چاہتے تھے۔

اتنی صلاحیتوں اور بہت سے متصادم جذبات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی شخصیت میں
ایک ٹھہراؤ پیدا کرنے سے پہلے وہ کئی سال تک زبردست روحانی ہیجان کا شکار رہے۔
سترہ اور اکیس سال کی عمر کے درمیان (۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء کے خاتمہ تک) کئی ذہنی
بحران آئے جن کی شدّت بڑھتی ہی رہی جب تک کہ مذہبی ایقان نے قطعی طور سے
ان کا خاتمہ نہیں کر دیا۔

سب سے پہلے وہ جان اسٹورٹ مِل کی کتاب اسیز آن ریلیجن سے متاثر ہوئے
جس نے ان کی خدا پرستی کی اس رجائیت پسندانہ سطح کو چور چور کر دیا جو جدّت پسند برہمو
سماجی حلقوں کے اثر سے وجود میں آئی تھی۔ انھیں فطرت میں بدی کا چہرہ نظر آنے لگا
اور انھوں نے اس سے بغاوت کر دی۔ انھوں نے اپنے ذہن سے مطابقت رکھنے والے
ہربرٹ اسپنسر کے نظریات کو اپنانے کی بے سود کوشش کی۔ اپنے کالج کے زیادہ معمّر
طلباء خاص کر برجیندر ناتھ سیال سے مشورے مانگے۔ سیال کو انھوں نے اپنی تشکیک کا
رازدار بنا لیا اور ان سے استدعا کی کہ وہ حق کی تلاش میں ان کی اعانت کریں۔ سیال ہی کے
اشارے پر انھوں نے شیلی کا مطالعہ کیا اور اس کے عقیدۂ وحدت وجود کی تخئیلی لہروں میں
اپنی تپش آمادہ روح کو غرق کر لیا۔ اُن کے اس نوجوان گروہ نے اس کے بعد انھیں خود اپنے
تصوّر کے عقلیت کے دیوتا "برا برہمن" کی خدمت پر آمادہ کرنا چاہا۔ برجیندر کی یہ تعقّل
پسندی خاص قسم کی تھی کیونکہ اس میں ویدانت کی خالص وحدت پرستی، ہیگل کے تصورِ مطلق

کی منطق اور فرانسیسی انقلاب کے عقیدۂ آزادی، اخوت اور مساوات کا امتزاج تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ انفرادیت کا اصول "شر" ہے اور آفاقی تعقل پسندی کا اصول "خیر" ہے۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ خالص عقل کا اظہار ہو، عہد حاضر کا یہی سب سے بڑا مسئلہ تھا اور برجندر اُسے انقلاب سے حل کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی انقلابی اور اعلیٰ تعقل پسندی نریندر کی تحکمانہ فطرت کے بعض پہلوؤں کے لئے جاذب توجہ تھی۔ لیکن ان کی (نریندر کی) ہیجان خیز شخصیت اس طرح کی حدوں میں بند بھی نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ اگرچہ ان کا ذہن اسی آفاقی تعقل پسندی کے اقتدار کو تسلیم کرنے اور اخلاقی بنیادوں کو انفرادیت کی قطعی نفی کا اصول بنانے پر آمادہ تھا لیکن ان کی زندگی اس کے لئے رضامند نہ تھی۔ وہ دنیا کے حسن اور اس کے پرجوش جذبات کے نشے میں بہت زیادہ سرشار تھے۔ انھیں اس سے محروم کرنے کی کوشش کرنا ایسا ہی تھا جیسے کسی جوان شکاری درندے کو ترکاری پر زندگی بسر کرنے کی سزا دی جائے۔ ان کی افسردہ دلی اور کرب میں اضافہ ہو گیا۔ انھیں محیطِ کُل عقل اور بےحس خدا کے عقیدے پر زندہ رکھنا ان کے ساتھ مذاق کرنا تھا۔ وہ ایک سچے ہندو تھے جس کے لئے زندگی اگر سچائی کی اصل رُوح نہیں تو پہلی خصوصیت ضرور ہے۔ اس لئے وہ زندہ انکشاف چاہتے تھے۔ ایسا مطلق خدا جو انسان بن گیا ہو، کوئی مقدس گرو جو اُن سے یہ کہہ سکے "میں نے خدا کو دیکھا ہے، میں نے اُسے چھوا ہے، میں وہ (خدا) رہ بھی چکا ہوں!" بہرحال اُن کا ذہن جو یوروپی خیالات اور اپنے والد سے وِرثے میں ملی ہوئی ناقدانہ رُوح کے سائے میں پروان چڑھا تھا، اپنے دل اور جذبات کی اِس تمنّا کے خلاف بغاوت کرتا تھا جیسا کہ رام کرشن کے متعلق ان کے پہلے ردعمل سے معلوم ہو گا۔

اس وقت کے بنگال کے سبھی نوجوان دانشوروں کی طرح وہ بھی کیشب چندر سین کی نورانیت کی جانب کھینچ رہے تھے۔ اس زمانے میں وہ اپنے کامل عروج پر تھی اور نرن (وویکانند) اس پر رشک آمیز نگاہیں ڈالتے تھے۔ نطرتاً انھیں اس نئے مسلک سے دلچسپی پیدا ہوئی اور انھوں نے اس میں شرکت اختیار کی۔ نئے برہمو سماج کے ممبروں کی فہرست میں ان کا نام بھی لکھ لیا گیا۔ رام کرشن مشن نے بعد میں یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ مکمل طور سے اس سماج کی قطعیت پسند اصلاحات کی روح سے متفق ہو ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ اصلاحات راسخ العقیدہ ہندومت کے بعض معقول تعصّبات کے مخالف تھیں۔ لیکن میرا ذاتی رجحان مجھے اُن سے اختلاف پر آمادہ کرتا ہے۔ نوجوان نرن کی منچلی طبیعت ان کے مکمل استیصال سے خوش ہوتی۔ وہ اس قسم کے آدمی نہ تھے کہ اپنے نئے ساتھیوں (برہمو سماج والوں) کو اس بت شکنی پر لعنت ملامت کرتے۔ یہ بات ان کے اندر بعد میں اور بہت حد تک رام کرشن کے اثر سے پیدا ہوئی کہ وہ فرسودہ عقائد اور رسوم کا بھی احترام کریں بشرطیکہ وہ قدیم روایات کے مطابق اور قومی زندگی کی روح میں بالکل پیوست ہو گئے ہوں لیکن مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ یہ صورت بغیر زبردست کشمکش کے نہیں پیدا ہوئی اور ایک حد تک وہ یہی ہے جو رام کرشن کی طرف سے ذہنی بے اعتقادی کی پہلی جھجک میں ظاہر ہوئی تھی۔ وقتی طور پر انھوں نے بنگال کے جدید برہمو حلقہ میں ہندوستانی عوام کو مذہب، نسل اور ذات کے فرق سے چھٹکارا دلا کر متحد اور ہمخیال بنانے کی غرض سے شرکت کر لی تھی۔ ان میں سے بعض ہندومت کے راسخ عقائد پر عیسائی مشنریوں سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ حملے کرتے تھے۔ لیکن مقدر یہ تھا کہ نرن کی آزاد اور زندہ ذہانت ایسے نقّادوں کی عقل سے خالی تنگ نظری کو فوراً محسوس کر لے جو

خود وہ گہرے تعصب سے آزاد نہ تھی۔ اس سے نہ صرف اُن کی رُوح کو بلکہ وقارِ قومی کے احساس کو چوٹ پہنچتی تھی۔ وہ مغرب کے کھونڈے طور سے حاصل کئے ہوئے علم کے سامنے ہندوستان کی حکمت کو نظر انداز کرنے والوں میں نہ تھے۔ پھر بھی وہ برہمو سماج کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے لیکن ان کے دل کو سکون نہ تھا۔

اس کے بعد انھوں نے تارک الدنیا ہوجانے والوں کی زندگی اختیار کرلی، ایک اندھیری سیلی کوٹھری میں رہنے لگے، ایک گدا بچھا کر زمین پر سونے لگے جس پر ہر طرف کتابیں بکھری ہوتی تھیں۔ وہیں فرش پر چائے بنا لیتے، دن رات پڑھتے اور غور و فکر میں غرق رہتے تھے۔ اُن کے سر میں ناقابلِ برداشت اور جان لیوا درد رہنے لگا لیکن انھیں اپنی فطرت کے اندر متصادم جذبات پر قابو حاصل نہ ہوسکا، جن کی کشمکش اچٹتی ہوئی نیندوں میں بھی جاری رہتی تھی۔

ان کا بیان ہے کہ "جوانی ہی سے ہر رات کو جب میں سوتا دو خواب ضرور دیکھتا تھا: ایک میں یہ دیکھتا کہ میں کرۂ ارض کے بہت بڑے لوگوں میں سے ہوں، زبردست دولت، عزت، اختیار اور شان و شوکت کا مالک ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میں ان سب کو اپنے پاس رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے میں یہ دیکھتا کہ میں نے تمام دنیوی چیزوں کو تیاگ دیا ہے، ایک معمولی سی لنگوٹی میں ہوں، خیرات پر بسر کر رہا ہوں اور درختوں کی جڑ پر سر رکھ کر سو رہتا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میں اس طرح کی زندگی بھی بسر کرنے کا اہل ہوں جیسے کہ عہدِ قدیم کے رشی بسر کرتے تھے۔ ان دو تصویروں میں سے دوسری مجھ پر غلبہ پا لیتی اور میں خیال کرتا کہ صرف اسی طرح ایک شخص سچی مسرت (آنند) حاصل کرسکتا ہے... پھر میں اسی مسرت کی لذت میں سو جاتا...... ہر رات کو یہی ہوتا......"

جب وہ رام کرشن سے ملنے گئے جوان کی باقی ماندہ زندگی پر اختیار رکھنے والے تھے،
اس وقت اُن کی یہی حالت تھی۔ اس عظیم الشان شہر میں جہاں ہندوستان اور یورپ ملتے تھے وہ
ہر مذہبی شخصیت کے یہاں پھیرے لگا چکے تھے اور ہر جگہ سے ناآسودہ پلٹے تھے، ان کی
تلاش بے سود رہتی، وہ انھیں آزماتے اور رد کر دیتے، اس طرح وہ گھومتے پھرتے رہے......

اس وقت ان کی عمر اٹھارہ سال تھی اور وہ یونیورسٹی کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔
نومبر ۱۸۸۰ء میں اپنے ایک دوست سریندر ناتھ مترا کے گھر پر ایک مختصر تقریب میں نرین نے
ایک خوبصورت سا مذہبی بھجن گایا تھا۔ مترا ایک دولت مند شراب فروش تھے جو اس ہندوستانی
مسیح (رام کرشن) کے ہاتھوں پر بیعت کر چکے تھے۔ رام کرشن کی عقابی نگاہ پہلی دفعہ اُن
کی (نرین کی) ناآسودہ رُوح کے آر پار گزر گئی۔ اس نے انھیں چن لیا۔ انھوں نے نرین سے
دکشنیشور آ کر اُن سے ملنے کے لئے کہا۔

نرین اپنے چند بے فکرے اور غیر سنجیدہ دوستوں کے ساتھ وہاں پہونچے۔ ماحول سے
بے پروا، بظاہر کچھ دیکھے سُنے بغیر، اپنے ہی خیالات میں غرق وہ اندر آئے اور بیٹھ گئے۔ رام کرشن
نے جو انھیں غور سے دیکھ رہے تھے، انھیں گانے کا حکم دیا، نرین نے تعمیل کی۔ اُن کے گیت
کا لہجہ ایسا دردمندانہ تھا کہ گرو جو نرین کی طرح موسیقی کے زبردست عاشق تھے، عالمِ وجد و جذب
میں پہونچ گئے۔ اب میں یہاں نرین کو خود ہی سب کچھ بیان کرنے دیتا ہوں۔

"جب میں گا چکا تو انھوں نے اچانک اُٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اُتری برآمدے میں
لے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ وہاں ہم دونوں تنہا تھے اور ہمیں کوئی دیکھ نہ سکتا تھا...... میری
حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ شدّتِ مسرّت سے رونے لگے۔ انھوں نے میرے ہاتھ اپنے ہاتھ
میں لے لئے اور بڑی نرمی سے مخاطب ہوتے، جیسے میں کوئی ایسا شخص تھا جسے وہ بہت دنوں سے

بے تکلفی سے جانتے تھے۔ انھوں نے کہا: "افسوس! تم بہت دیر میں آئے۔ تم اتنے بے رحم کیوں تھے کہ مجھے اتنے دنوں تک انتظار میں رکھا؟ میرے کان دوسروں کی بے نتیجہ باتیں سنتے سنتے تھک گئے۔ میں کس قدر بے قرار تھا کہ کوئی ایسا شخص ملے جس کے سینے میں اپنی روح کا سارا ابال بھر دوں اور جو میرے تمام باطنی تجربات کی آماجگاہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔" ہچکیاں لیتے ہوئے انھوں نے اپنی گفت گو جاری رکھی "میرے دیوتا! میں جانتا ہوں کہ تم قدیم رشی نارا ہو جو نارائن کے اوتار کی شکل میں زمین پر آئے تھے تاکہ انسانوں سے ان کی مصیبتیں دور کردیں۔"

میں حیرت میں پڑ گیا، یہ کیا ہو رہا ہے! میں نے سوچا انھیں ٹھیک راہ پر لگا دینا چاہئے۔ میں وشوناتھ دت کا بیٹا ہوں۔ یہ مجھ سے یہ سب کچھ کہنے کی جرأت کیسے کر رہے ہیں؟ ...... لیکن میں بظاہر بالکل غیر متاثر بنا ان کی باتیں سنتا رہا۔ انھوں نے میرا ہاتھ پھر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا: "وعدہ کرو کہ تم مجھ سے ملنے آؤ گے، اکیلے اور جلد...... !"

نرن نے اپنے اس عجیب میزبان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے جلدی سے وعدہ کرلیا لیکن اپنے دل میں طے کر لیا کہ اب کبھی یہاں نہیں آئیں گا۔ اب وہ دوسرے کمرے میں آئے جہاں اور لوگ تھے۔ نرن ذرا ہٹ کر دور بیٹھ گئے اور انھیں غور سے دیکھنے لگے۔ انھیں رام کرشن کی حرکات یا عادات میں کوئی چیز عجیب نہیں نظر آئی سوا ایک اندرونی منطق کے جس کے متعلق ان کا خیال تھا کہ پکے تیاگ اور زبردست خلوص کی مکمل زندگی کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے ان کے یہ الفاظ سنے (جو درحقیقت خود ان کی راتوں کی کشمکش کا فیصلہ کن جواب معلوم ہوتے تھے)

"خدا کو پایا جا سکتا ہے۔ ایک شخص اسے دیکھ سکتا ہے، اس سے باتیں کر سکتا ہے بالکل اسی طرح جیسے میں تمھیں دیکھ اور تم سے باتیں کر رہا ہوں۔ لیکن اس کے لئے ریاضت کون کرتا ہے؟ لوگ اپنی بیوی بچوں اور مال متاع کے لئے آنسو بہائیں گے لیکن خدا کی محبت میں کون روتا ہے؟ تاہم

اگر کوئی خلوص سے اس کے لئے روئے تو وہ اپنے تئیں اس پر ضرور ظاہر کرے گا۔"

کہنے والے کی بات سے یہ ظاہر تھا کہ یہ محض کھوکھلے الفاظ نہیں ہیں، وہ ان الفاظ کی سچائی کو ثابت کر چکا ہے۔ برزن کی آنکھوں نے جو حیرت انگیز منظر ابھی کچھ دیر پہلے دیکھا تھا اور اس سادہ اور سنجیدہ سادھو کی تصویر میں جو سامنے تھی کوئی مطابقت نظر نہیں آتی تھی۔ انھوں نے اپنے دل میں کہا۔" یہ کوئی مراقی ہے لیکن عظمت سے خالی بھی نہیں ہے۔ ممکن ہے مجنون ہو لیکن احترام کے قابل ہے۔" بڑی ذہنی کشمکش کی حالت میں وہ دکشینیشور سے واپس آئے۔ اگر اس وقت ان سے کوئی پوچھتا کہ رام کرشن سے ان کے تعلقات آئندہ کیا ہوں گے تو وہ یقیناً یہی جواب دیتے کہ ویسے ہی ہوں گے جیسے تھے۔

لیکن عجیب و غریب مکاشفہ اُن پر اندرونی عمل کرتا رہا۔

ایک مہینے کے بعد وہ پیدل چل کر دکشینیشور پہونچے۔ اُن کا بیان ہے کہ:

"میں نے انھیں اپنی چھوٹی سی چارپائی پر تنہا بیٹھے ہوئے پایا۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور بڑی شفقت سے اسی چارپائی کے ایک کونے پر اپنے قریب بیٹھ جانے کو کہا۔ لیکن ایک لمحہ کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ جذبات سے کچھ بے اختیار ہو رہے ہیں۔ اُن کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں، آہستہ آہستہ وہ کچھ بُدبُداتے اور میرے قریب آگئے۔ میں نے سمجھا کہ پچھلی بار کی طرح وہ پھر کوئی عجیب و غریب بات کہنے والے ہیں لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کہہ سکوں انھوں نے اپنا داہنا پاؤں میرے جسم پر رکھ دیا۔ بوجھ شدید تھا۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور میں نے دیکھا کہ کمرے کی دیواریں اور ہر چیز گھوم رہی ہے اور غائب ہوتی جا رہی ہے...... ساری کائنات اور خود میری انفرادیت ایک ساتھ کسی بے نام خلا میں گم ہوگئی جو ہر چیز کو نگلے جا رہا تھا۔ میں خوفزدہ تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اب موت کا سامنا ہے۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے چیخ کر کہا: "یہ آپ کیا

کر رہے ہیں؟ میرے ماں باپ ہیں۔۔۔۔۔۔' اس پر وہ ہنسنے لگے اور اپنا ہاتھ میرے سینے پر پھیر کر کہا: 'اچھا اس وقت اتنے ہی پر ختم'۔ انھوں نے یہ الفاظ کہے ہی تھے کہ وہ عجیب و غریب حالت ختم ہو گئی اور ہر چیز، ظاہر و باطن اپنی جگہ پر آ گئی۔"

میں نے یہ سارا حیرت خیز بیان بغیر کسی قسم کی تنقید و تبصرے کے لکھ دیا ہے۔ ایک مغربی قاری جو کچھ بھی سوچے لیکن وہ ان ہندوستانی سادھوؤں کے خلاق و اہمہ پر متعجب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسے موقعہ پر یقیناً اُسے شیکسپیر کے زبردست صاحبانِ کشف یاد آئیں گے۔ اس وقت ضمناً اس بات کو ضرور ذہن میں رکھنا چاہئے کہ یہاں صاحبِ کشف کوئی کمزور ضعیف الاعتقاد اور بے بصر شخص نہ تھا۔ ویویکانند خود اپنے اس کشف سے بغاوت کر رہے تھے۔ اُن کی زبردست شخصیت، خطرے کا احساس کر کے ہر طرح کے عملِ توجہ کے مخالف تھی اور اپنے دل سے یہ پوچھتی تھی کہ کہیں اُن پر کسی قسم کا مسمریزم تو نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن انھیں اس کی کوئی علامت نظر نہیں آتی تھی۔ اُس طوفان کے خوف سے جو اُن پر گزرا تھا، وہ اب بھی اپنی حفاظت کر رہے تھے لیکن اس ایک جھٹکے کے علاوہ اب ہر ملاقات بالکل معتدل تھی۔ رام کرشن اس مہمان کے ساتھ سادگی اور مانوس قسم کی مہربانی کا برتاؤ کر رہے تھے، جیسے پہلے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

غالباً ایک ہفتہ بعد جب وہ تیسری دفعہ گئے تو اپنی تمام ناقدانہ صلاحیتوں کو بیدار رکھنے کے باوجود وہ مدافعت پر آ گئے تھے۔ سری رام کرشن انھیں قریب کے ایک باغیچہ میں لے گئے، کچھ دیر ٹہلنے کے بعد وہ نشست گاہ میں بیٹھ گئے۔ ٹھیک اسی وقت اُن پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی، نریندر اسے دیکھ رہے تھے کہ اچانک اُن کا جسم چھو گیا۔ نریندر کے ظاہری حواس ایک دم غائب ہو گئے، جب کچھ دیر بعد وہ اپنے آپ میں آئے تو دیکھا کہ رام کرشن انھیں دیکھ رہے ہیں اور اُن کے سینے کو تھپتھپا رہے ہیں۔

بعد میں گرو نے اپنے شاگردوں سے کہا: "جب وہ (نریندر) اس حالت میں تھے، میں نے اُن سے کئی سوال پوچھے، میں نے اُن سے اُن کی پہلے کی زندگی اور ماحول، اس دُنیا میں ان کے مشن اور دنیوی زندگی کی مدّت کے متعلق دریافت کیا۔ وہ اپنے وجود کی گہرائیوں میں اتر گئے اور انھوں نے میرے سوالوں کے مناسب جواب دیئے۔ ان سے انھیں باتوں کی تصدیق ہوئی جو میں نے ان میں دیکھی اور ان کے بارے میں اخذ کی تھیں۔ یہ باتیں ہمیشہ راز میں رہیں گی لیکن مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ایک رشی ہیں جس نے تکمیل کی منزلیں طے کرلی ہیں، مراقبہ میں مہارت حاصل کرلی ہے اور جس دن انھیں اپنی اصلِ فطرت کا علم ہو جائے گا وہ اپنے ارادے سے اس جسم کو تیاگ دیں گے ......"

لیکن اُس وقت رام کرشن نے اُن سے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا اگرچہ وہ اُن کے ساتھ اس کے مطابق برتاؤ کرتے رہے جو انھیں اپنے مخصوص علم سے معلوم ہو گیا تھا، اس طرح شاگردوں میں نرین کو ایک امتیازی مقام حاصل ہو گیا۔

لیکن ابھی تک نرین نے چیلے کا لقب قبول نہیں کیا تھا، وہ کسی کے چیلے بننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اُن پر رام کرشن کی لامحدود قوّتوں کا زبردست اثر تھا، وہ انھیں اس طرح کھینچتا تھا جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے لیکن وہ خود بھی بڑی سخت دھات کے بنے ہوئے تھے۔ ان کی عقل اقتدار کے آگے سر جھکانے پر تیار نہ تھی۔ بر جنبِ رسیال سے تعلّقات میں اگر یہ اُن کا دل تھا جو عقل کی مخالفت کر رہا تھا تو اس وقت ان کی عقل دل کو شبہ کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی آزادی کو برقرار رکھنے پر مُصر تھے اور گرو سے کوئی ایسی چیز حاصل نہیں کرنا چاہتے تھے جو خود اُن کی عقل کے بالکل قابو میں نہ رہے۔ دوسروں کے لیے بڑھے ہوئے عقائد اُن کے دل میں نفرت پیدا کرتے تھے۔

اِس نوجوان اور بوڑھے گرو میں جو تعلقات قائم تھے اُن سے عجیب تر تعلقات کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ نرین جذباتی پاکیزگی کی ہر شکل کو جیسے آنسو بہانا یا وقتی ایسی بات کرنا جو کمزوری کی نشانی ہو، ناپسند کرتے تھے۔ وہ ہر چیز کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے تھے اور عقل کو ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے پاس سے جدا نہ ہونے دیتے تھے۔ وہ خاموشی سے رام کرشن کے ہر لفظ کو پرکھتے تھے اور دل ہی دل میں اُن پر شک کرتے تھے۔ رام کرشن اس پر رنجیدہ ہوتا تو گویا اُن سے اور زیادہ محبت کرتے تھے۔ نرین کی ملاقات سے پہلے انھیں یہ دعا مانگتے سُنا گیا تھا: "ماتا کسی ایسے کو بھیج دو جو میری حصول یابی پر شک کرے۔"

ماتا نے ان کی دعا سُن لی۔ نرین ہندو دیوتاؤں کے منکر تھے لیکن اسی کے ساتھ وہ ادویت (توحیدی مسلک) کا بھی انکار کرتے تھے کیونکہ وہ اُسے دہریت سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ بیدھڑک ہندو کتبِ مقدسہ کا مذاق اُڑاتے تھے۔ انھوں نے رام کرشن سے کہا: "چاہے آپ کو لاکھوں انسان خدا کہتے لیکن اگر مجھ پر خود یہ بات ثابت نہ ہو جاتی تو میں ہرگز نہ کہتا۔"

رام کرشن اس بات کو ہنس کر تسلیم کرتے اور اپنے شاگردوں سے کہتے: "کسی بات کو اس لئے نہ مانو کہ میں کہتا ہوں بلکہ خود سے پرکھو۔"

نرین کے تیز اعتراضات اور پرجوش دلائل انھیں خوش کر دیتے تھے۔ وہ اُن کے بے پناہ ذہنی خلوص کو، جس میں تلاشِ حق کا زبردست جذبہ تھا، بڑے احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ اسے شیو کی قوت کا مظہر سمجھتے تھے جو آخر کار تمام توہمات پر فتح پا لے گی۔ وہ کہتے تھے، "دیکھو! ان کے اندر گہرائی میں جانے کی کتنی قوت ہے! وہ ایک بھڑکتی ہوئی آگ ہیں جو تمام ناپاکیوں کو بھسم کرے گی۔ مہامایا (کالی دیوی) خود اُن کے دس فٹ قریب نہیں آسکتیں، جو جلال

انھوں نے نرین کو عطا کر دیا ہے اُس کے سامنے وہ خود رُک جاتی ہیں۔"

نرین کی علمیت ان میں ایسی زبردست خوشی پیدا کر دیتی کہ کبھی کبھی وہ عالمِ جذب و وجد میں پہونچ جاتے۔ بعض دوسرے مواقع پر رام کرشن نرین کی اُن تیز تنقیدوں سے رنجیدہ بھی ہو جاتے جو دوسروں کے جذبات کا ذرا بھی لحاظ کئے بغیر کی جاتی تھیں۔ نرین ان کے منھ پر کہتے تھے "آپ کو یہ کیسے یقین ہے کہ آپ کے سارے کشف آپ کے بیمار ذہن کا یا توہم کا نتیجہ نہیں ہیں؟"

رام کرشن اس اُلجھن میں وہاں سے ہٹ جاتے اور تسلّی کے لئے سیدھے ماتا کے پاس پہنچتے جو انھیں ان الفاظ میں تسکین دیتی تھیں، "صبر کرو! بہت جلد نرین کی چشمِ بصیرت کھل جائے گی۔"

کبھی کبھی جب نرین اور دوسرے شاگردوں کے غیر مختتم مباحثے انھیں تھکا ڈالتے تو وہ یہ دعا مانگتے تھے: "ماتا! نرین کو اپنی مایا میں سے تھوڑا سا دے دو! تاکہ اُن پر سے عقلیت کا بخار کسی قدر اُتر جائے اور اُن کا دل خدا کا لمس محسوس کر لے۔"

لیکن وویکانند کی کرب میں مبتلا روح چیخ اُٹھتی تھی: "مجھے خدا نہیں چاہیئے میں سکون چاہتا ہوں یعنی مکمّل سچائی، مکمّل علم اور مکمّل لامتناہیت۔"

انھیں اس بات کا خیال نہیں تھا کہ یہ خواہش کرنا عقل کی حدوں سے آگے بڑھ جانا ہے، یہاں وہ اپنے دل کی تحکمانہ غیر معقولیت کا اظہار کرتے تھے۔ خدا کے ثبوت سے اُن کے ذہن کو مطمئن کرنا ناممکن تھا۔ ہندوستانی انداز میں وہ مُصر تھے کہ "اگر خدا حقیقی ہے تو اُسے پالینا بھی ممکن ہے۔"

آہستہ آہستہ اُن پر یہ بات منکشف ہوئی کہ یہ مجذوب (رام کرشن) جسے وہ پہلے دل کے اشاروں پر چلنے والا سمجھتے تھے قطعی طور سے عقل و علم پر اُن سے زیادہ حاوی ہے۔ بعد میں

وہ رام کرشن کے متعلق کہتے تھے کہ "ظاہری طور سے وہ بالکل بھگت تھے لیکن باطناً ایک سر گیان ...... میں بالکل اس کے برعکس ہوں۔"

قبل اس کے کہ وہ اس طرح کا خیال ظاہر کریں اور خود اپنی آزادی کو خوشی سے گرو کے ہاتھوں میں سونپ دیں، اُن کا یہ حال تھا کہ وہ انھیں ڈھونڈتے بھی تھے اور ان سے بھاگتے بھی تھے۔ دونوں کے درمیان ایک پُرجوش کشش اور ایک پُراسرار کشمکش کا باہمی کھیل جاری تھا۔ نرین کی جارحانہ صاف گوئی، ہر اس چیز سے بیگانہ وحشی کا اظہار جس سے وہ مشکوک تھے، ہر طرح کے ڈھونگ کے خلاف اعلانِ جنگ اور دوسروں کی رایوں کی طرف سے ایک متکبّرانہ بے اعتنائی، ان سب کا نتیجہ یہ تھا کہ لوگ ان کے دشمن ہو گئے تھے اور طرح طرح کے الزام لگاتے تھے، وہ اپنی تمکنت میں اُن کی پروا بھی نہ کرتے تھے۔

رام کرشن اپنے سامنے کبھی ایسی باتیں کہنے کی اجازت نہیں دیتے تھے کیونکہ انھیں نرین پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ نوجوان خالص سونا ہے اور اس دنیا کی کوئی گندگی اس میں زنگ نہیں لگا سکتی۔ انھیں اگر خطرہ تھا تو صرف یہ کہ کہیں یہ قابلِ تحسین ذہن اپنی راہ سے بھٹک نہ جائے اور صلاحیت کی یہ فراوانی جو اُن کے اندر کشمکش پیدا کرتی رہتی ہے غلط طرح سے استعمال نہ ہونے لگے، مثلاً اتحاد و اشتراک کے کام کے لئے وقف ہونے کے بجائے کوئی نیا فرقہ یا جماعت بنانے میں نہ لگ جائے۔ ان کے دل میں نرین کی بے پناہ محبّت تھی لیکن اگر کبھی وہ کچھ دیر کے لئے بھی دور ہو جاتے تو رام کرشن کی پریشانی اور تعلقِ خاطر کا اظہار انھیں اُلجھن میں ڈالتا اور خفا بھی کر دیتا۔ رام کرشن خود اس پر شرمندہ ہوتے لیکن مجبور تھے۔ وہ ان کی بے انتہا تعریف کر کے بھی نرین کو ناراض کر دیتے مثلاً ایسی تعریف جب انھوں نے مستند شہرت رکھنے والے کیشب چندر کو تمام لوگوں کے

سامنے اس بحث طلب شہرت رکھنے والے نوجوان سے کمتر درجے پر رکھ دیا، جبکہ ابھی اُس نے دنیا میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔ وہ انھیں کلکتہ کی سڑکوں پر تلاش کرتے پھرتے تھے اور سادھارن برہمو سماج کے مندر میں بھی انھیں کے لئے جاتے تھے جہاں عبادت کے وقت اُن کے خلاف امید داخلے نے ایک بدنامی کی شکل اختیار کر لی اور اس فعل کی بہت ہی ذلت آمیز نکتہ چینی کی گئی۔ اس پر شرمندگی اور ذلت محسوس کرتے ہوئے نرن نے اس وقت انھیں سخت سُست بھی کہا تاکہ وہ اُن کا اس طرح پیچھا کرنا چھوڑ دیں۔ انھوں نے رام کرشن سے کہا کہ کسی کو دوسرے شخص کا ایسا گرویدہ نہیں ہونا چاہئے اور اگر وہ اُن کی محبّت میں اسی طرح مبتلا رہے تو وہ خود اپنی روحانی عظمت کھو بیٹھیں گے اور انھیں کی نیچی سطح پر آجائیں گے۔ سادہ دل اور پاک نفس رام کرشن نے خوف زدہ ہو کر یہ باتیں سُنیں اور جا کر ماتا سے صلاح مانگی لیکن وہاں سے مطمئن لوٹے۔

انھوں نے نرن سے کہا: "تم بڑے ظالم ہو! میں تمھاری بات نہیں سُنوں گا۔ ماتا نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تم سے اس لئے محبّت کرتا ہوں کہ میں تمھارے اندر خدا کو دیکھتا ہوں۔ اگر کبھی وہ وقت آیا کہ میں اُسے نہ دیکھوں تو میں تمھیں دیکھنے کا بھی روادار نہ ہوں گا۔"

بہت جلد اُن کا معاملہ برعکس ہو گیا۔ ایک ایسا وقت آیا کہ نرن کی موجودگی رام کرشن کو بالکل بے اعتنا پاتی تھی۔ وہ گویا اُن کی موجودگی کو محسوس نہ کرتے تھے اور دوسروں سے باتوں میں لگے رہتے تھے۔ اس کا سلسلہ ہفتوں جاری رہا اور نرن پلٹ پلٹ کر آتے رہے۔ رام کرشن نے پوچھا بھی کہ اب جو میں تم سے باتیں بھی نہیں کرتا تم کیوں آتے ہو تو نرن نے جواب دیا: "میرے لئے صرف آپ کے الفاظ میں کشش نہیں ہے بلکہ میں آپ سے

محبّت کرتا ہوں اور آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

آہستہ آہستہ گرو کی رُوح نے باغی چیلے پر اچھی طرح قابو پا لیا۔ وہ رام کرشن کے عقائد اور خاص کر ان دو متضاد عقائد کا بے سُود مذاق اُڑاتے رہے، مورتی پوجا اور وحدتِ مطلق پر یقین۔ خدا کے جادو نے دھیرے دھیرے اپنا کام کیا۔

رام کرشن نے ان سے پوچھا، "اگر تم میری ماتا کو تسلیم نہیں کرتے تو یہاں آتے کیوں ہو؟"

نرین نے جواب دیا، "کیا یہاں آ کر ان کا تسلیم کرنا لازمی ہے؟"

رام کرشن نے کہا، "خیر، دیکھنا، کچھ دن بعد تم نہ صرف انھیں قبول کرو گے بلکہ ان کا نام سن کر رونے لگو گے۔"

جب رام کرشن نے نرین پر ادویت ویدانت کے فلسفۂ اتّحادِ کامل کا در کھولنا چاہا، اس وقت بھی یہی ہوا۔ نرین نے اس عقیدے کو کفر اور پاگل پن سمجھ کر رد کر دیا۔ وہ کسی موقع پر بھی اس کا مذاق اڑانے سے نہ چوکتے تھے۔ ایک دن تو وہ اور ایک دوسرے چیلے نے اس کا مذاق اڑایا اور اس کی نامعقولیت پر ہنستے ہنستے لوٹ گئے، "یہ گلاس خدا ہے! ...... یہ مکھیاں خدا ہیں! ...." پاس والے کمرے سے رام کرشن نے ان شاگردوں کی ہنسی سنی اور ایک نیم مجذوبانہ حالت میں اندر آ کر انھوں نے نرین کو چھوا۔ چھوتے ہی اُن پر ایک رُوحانی طوفان گزر گیا۔ اچانک نرین کی نگاہوں میں ہر چیز بدل گئی، انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ خدا کے سوا اب کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔ وہ اپنے گھر واپس آ گئے۔ اب وہ جس چیز کو دیکھتے، چھوتے اور کھاتے تھے، ہر چیز خدا لگتی تھی۔ اس آفاقی قوّت سے معمور ہو کر انھوں نے سارے کام چھوڑ دئے۔ اُن کے والدین متفکر ہوئے اور انھیں خیال ہوا کہ انھیں کوئی بیماری ہو گئی ہے۔

کئی روز تک اسی حالت میں رہے، پھر یہ خواب ختم ہوگیا۔ لیکن اس کی یاد ادویتی حالت کی ایک لذت کی طرح ان کے ساتھ رہی اور پھر انھوں نے کبھی اس کا انکار نہیں کیا۔

اس کے بعد وہ کئی صوفیانہ طوفانوں کے اندر سے گزرے۔ وہ پاگلوں کی طرح "شیوا! شیوا!" کا وِرد کرتے تھے اور رام کرشن انھیں ایک عارفانہ ترحّم کی نظر سے دیکھتے اور کہتے تھے "ٹھیک ہے، میں بھی بارہ سال تک اسی حالت میں رہ چکا ہوں۔"

لیکن ان کا شیرانہ مزاج جو طنز آمیز انکار سے ادراکِ نور تک کی جست لگاتا تھا، کبھی مستقل تغیر کا شکار نہ ہوتا۔ اگر صرف باہر ہی سے نہیں بلکہ اندر سے بھی قلعہ میں بارود کی سرنگیں نہ بچھ رہی ہوتیں۔ اچانک غم کی تہرناکی نے کوڑے مار کر انھیں آسودگی بخش تشکیک اور عقل پرستی کے تعیش سے جس پر انھیں ناز تھا، باہر نکالا اور وجود اور بدی کے المناک مسئلہ کے سامنے لا کھڑا کیا۔

۱۸۸۴ء کی ابتدا میں اُن کے مُسرف اور لاابالی باپ کا اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوگیا اور خاندان تباہی کے منھ میں پہونچ گیا۔ گھر میں چھ سات کھانے والے تھے اور قرض خواہوں کی ایک پوری فوج۔ اس دن سے نرین نے فلاکت کا مزہ چکھا، دوستوں کی کنارہ کشی اور تلاشِ معاش کی بے سود دوا دوش سے واقف ہوئے۔ انھوں نے اپنی پریشانیوں کا ذکر چند صفحات میں کیا ہے جن کا شمار نہایت ہی تکلیف دہ اعترافات میں ہوگا۔

"میں بھوک سے مرنے کے قریب پہونچ گیا، ننگے پاؤں ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک مارا مارا پھرتا اور ہر جگہ سے دھتکارا جاتا۔ اس میں مجھے انسانی ہمدردی کا بھی تجربہ ہوا۔ زندگی کی حقیقتوں سے یہ میرا پہلا سابقہ تھا۔ مجھ کو معلوم ہوا کہ اس دنیا میں کمزور، مفلس اور بے سہارا لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ لوگ جو ابھی چند دن پہلے میری مدد کرنے پر فخر

کرتے، اب مجھے دیکھ کر منھ پھیر لیتے تھے حالانکہ وہ مدد کر سکتے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ دنیا شیطان کی پیدا کی ہوئی ہے۔ ایک دن جب بڑی گرمی تھی اور میں مشکل سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ میں ایک مجسّمہ کے سایہ میں بیٹھ گیا۔ وہاں کئی دوست تھے۔ اُن میں سے ایک نے خدا کی رحمتوں کے متعلق کوئی گیت گانا شروع کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے دماغ کو چوٹ پہنچانے کے لئے جان بوجھ کر یہ کیا جا رہا ہے۔ مجھے اپنی ماں اور بھائیوں کی قابلِ رحم حالت کا خیال آیا اور میں نے چیخ کر کہا "یہ گیت بند کر دو! ایسی خیالی باتیں انھیں کو اچھّی معلوم ہو سکتی ہیں جنھوں نے دولت کی آغوش میں جنم لیا ہے اور جن کے ماں باپ اپنے گھروں میں فاقہ سے مر نہیں رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں بھی اسی طرح سوچا کرتا تھا لیکن اب جب سے مجھے زندگی کے مظالم سے سابقہ پڑا ہے، ایسی باتیں مجھے زہریلا مذاق معلوم ہوتی ہیں۔ میرے دوست کو ان باتوں سے تکلیف پہنچی، وہ میری اذیت ناک حالت کا اندازہ نہ کر سکا۔ اکثر ایسا معلوم ہوتا کہ جب گھر میں سب کے کھانے کے لئے کافی نہ ہوتا تو میں ماں سے یہ کہہ کر باہر نکل جاتا کہ میری ایک جگہ کھانے کی دعوت ہے اور بھوکا رہتا۔ میرے دولتمند دوست کبھی کبھی مجھے اپنے گھر کھانے کے لئے مدعو کرتے لیکن ان میں سے کسی نے بھی کبھی میری زبوں حالی پر تعجب کا اظہار نہیں کیا اور میں نے بھی اسے اپنے ہی تک رکھا......"

اس زمانہ میں وہ ہر صبح خدا کی عبادت کرتے تھے۔ ایک دن ان کی ماں نے، جن کی پاک نفسی زبردست بدنصیبیوں کی وجہ سے بالکل متزلزل ہو گئی تھی، انھیں دعا مانگتے دیکھ کر کہا، "بیوقوف ہوتے ہو؟ خاموش رہو! بچپن سے خدا سے دعا مانگتے مانگتے تمھاری آواز بیٹھ گئی ہے۔ اُس نے تمھارے لئے کیا کیا؟......"

پھر وہ خدا سے ناراض ہو گئے، اس نے اُن کی مضطرب التجاؤں کا کوئی جواب کیوں نہیں دیا؟ اُس نے زمین پر اتنی تکالیف کیوں نازل کر رکھی ہیں؟ اُن کے ذہن میں پنڈت ودیّاساگر کے تلخ الفاظ گونجنے لگتے، "اگر خدا نیک اور رحمدل ہے تو پھر لاکھوں انسان چند لقمے کھانے کے بغیر کیوں مر جاتے ہیں؟"[1]

عالمِ بالا کے خلاف بغاوت کا زبردست جذبہ اُن کے اندر پیدا ہوا اور انھوں نے خدا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔

وہ کبھی اپنے خیالات پوشیدہ نہیں رکھ سکتے تھے اور اب تو انھوں نے خدا کے خلاف اعلانیہ باتیں کرنا شروع کر دیں۔ انھوں نے ثابت کیا کہ یا تو خدا کا وجود ہی نہیں ہے یا اگر ہے تو بہت بُرا ہے۔ ایک دہریہ کی حیثیت سے اُن کی شہرت پھیل گئی اور جیسی کہ مذہبی لوگوں کی عادت ہے انھوں نے اُن کی بداعتقادی سے ناقابلِ ذکر اغراض وابستہ کر دئے اور اُن کی عادتوں پر بدنیتی سے اتّہام لگائے۔ اس طرح کی بے ایمانیوں نے انھیں اور سخت بنا دیا اور کھلے بندوں اُنھیں اس پر فخر کرنے میں ایک غمناک مزہ آنے لگا کہ اس طرح کی اخلاق

---

[1] پنڈت ودیاساگر (ایشور چند ۱۸۲۰ء تا ۱۸۹۱ء) ایک سماجی مصلح اور سنسکرت کالج کلکتہ کے ڈائرکٹر تھے۔ وہ رام کرشن کو بھی جانتے تھے۔ انھیں لوگ ان کے علم کے مقابلہ میں انسانی دوستی کی وجہ سے عزت سے یاد کرتے ہیں۔ وہ ۱۸۶۴ء کے اس قحط کے مجبور تماشائی تھے، ایک لاکھ سے زیادہ جانیں جس کا شکار ہوئیں۔ اس نے انھیں خدا کا منکر بنا دیا اور وہ مکمل طور سے خدمتِ خلق کے لئے وقف ہو گئے۔ ۱۸۹۸ء میں وویکانند نے اپنے کشمیر کے ایک سفر کے درمیان بڑے خاموش احترام سے اُن کا تذکرہ کیا جس میں الزام کا کوئی لفظ نہ تھا۔ اسے سسٹر نویدیتا نے سوامی سے اپنی بات چیت کے سلسلہ میں قلمبند کیا ہے۔ (سوامی وویکانند کے ساتھ چند یاتراؤں کے خلاصے۔ اُدبودھن آفس کلکتہ)

سے گری ہوئی دنیا میں اُن کے سے بدقسمت اور ستائے ہوئے شخص کو اس بات کا ہر طرح سے حق حاصل ہے کہ وہ وقتی طور پر سکون حاصل کرنے کے لئے جس بات میں اُسے خوشی نصیب ہو وہی کرے اور اگر وہ (نرینیدر) طے کرلے کہ یہ ذریعے موثر ہیں تو کسی کے ڈر سے وہ اس سے باز بھی نہیں آسکتا۔ رام کرشن کے بعض شاگردوں کو جو نیکی کی تلقین کرتے تھے، وہ یہ جواب دیتے کہ صرف ایک بزدل ہی خوف کی وجہ سے خدا پر عقیدہ رکھ سکتا ہے۔ اس طرح وہ انھیں شکست دے دیتے۔ اس کے ساتھ انھیں یہ خیال تکلیف دہ معلوم ہوتا کہ کہیں اوروں کی طرح رام کرشن بھی انھیں کو الزام نہ دیں۔ ایسے وقت میں اُن کا جذبۂ تکبر بغاوت کرتا: "اس سے کیا ہوتا ہے! اگر کسی شخص کی شہرت ایسی ہی کمزور بنیادوں پر ہے تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ میں اسے بھی اپنے قدموں تلے روندتا ہوں......"

دکشنیشور میں بیٹھے ہوئے رام کرشن کے علاوہ ہر شخص انھیں گمراہ خیال کرتا تھا، انھیں نرین پر اعتماد تھا لیکن وہ نفسیاتی موقع کے انتظار میں تھے۔ انھیں یقین تھا کہ نرین کی نجات انھیں کے ذریعہ ہوگی۔

گرمیاں گزر گئیں۔ نرین کی روزی کمانے کی پریشان کن تلاش جاری رہی۔ ایک دن شام کے وقت جب وہ فاقے سے تھے اور بھیگے ہوئے، وہ سڑک پر ایک مکان کے سامنے تھک کر گر پڑے۔ زمین پر پڑے ہوئے جسم میں بخار سرسامی حد تک تیز تھا۔ اچانک ایسا معلوم ہوا کہ جو بندھن اُن کی رُوح کو باندھے ہوئے تھے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور روشنی ہو گئی۔ پچھلے تمام شکوک خود بخود رفع ہو گئے۔ وہ سچائی کے ساتھ یہ کہہ سکتے تھے کہ: "میں دیکھتا ہوں، میں جانتا ہوں، میں یقین کرتا ہوں، میں دھوکے میں نہیں ہوں....."

ان کے جسم اور ذہن دونوں کو سکون تھا۔ وہ مکان کے اندر چلے گئے اور ساری رات

مراقبے میں صرف کر دی۔ صبح کو وہ فیصلہ کر چکے تھے۔ انھوں نے اپنے دادا کی طرح دنیا کو ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور ایک دن بھی مقرر کر لیا تھا جب یہ عہد پورا کیا جائے گا۔

اب یہ ہوا کہ بغیر کسی علم کے رام کرشن اسی دن کلکتہ آئے اور نریندر سے درخواست کی کہ وہ ان کے ساتھ رات بھر کے لئے دکشینیشور چلے چلیں۔ نرن نے اس سے بچنے کی بے سود کوشش کی لیکن پھر وہ اُن کے ساتھ جانے پر مجبور ہو گئے۔ اس رات کو جب دونوں کمرے میں تنہا بند تھے رام کرشن نے گانا شروع کیا۔ اُن کے خوبصورت نغمہ پر نوجوان شاگرد کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے کیونکہ انھیں ایسا محسوس ہوا کہ گرو نے اُن کا مقصد پا لیا ہے۔ رام کرشن نے اُن سے کہا، "میں جانتا ہوں کہ تم دنیا میں نہیں رہ سکتے لیکن میرے لئے اس وقت تک اس میں رہو جب تک میں زندہ ہوں۔"

نرن اپنے گھر واپس گئے۔ انھیں ایک ترجمہ کے محکمہ میں اور ایک وکیل کے دفتر میں کچھ کام مل گیا تھا۔ یہ کوئی مستقل ملازمت نہ تھی اس لئے اُن کے خاندان کا مستقبل ٹھیک نہ تھا، جو آج ہے ممکن ہے وہ کل نہ ہو! (ایک دن) انھوں نے رام کرشن سے التجا کی کہ وہ اُن کے لئے دعا کریں۔

رام کرشن نے کہا: "بٹیا! میں یہ دعا نہیں کر سکتا۔ تم خود کیوں نہیں کرتے؟"

نرن کالی دیوی کے مندر میں گئے۔ اُن پر ایک ہیجان انگیز جوش طاری تھا، محبت اور دینداری کا ایک سیلاب اُن کے اندر ہو کر بہہ رہا تھا۔ لیکن جب وہ واپس آئے اور رام کرشن نے اُن سے پوچھا کہ دعا مانگی تھی یا نہیں تو نرن کو احساس ہوا کہ وہ اپنی پریشان حالی سے چھٹکارا پانے کی دعا کرنا تو بھول ہی گئے۔ رام کرشن نے اُن سے پھر واپس جانے کو کہا۔ وہ دوسری بار اور پھر تیسری بار واپس آئے۔ جیسے ہی وہ مندر میں داخل ہوتے تھے، دعا کا مقصد

اُن کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ تیسری کوشش میں انھیں یاد آیا کہ وہ کیا مانگنے آئے تھے۔ لیکن اس وقت ان پر شرم کا غلبہ ہوا، "یہ تو بہت چھوٹے مفاد ہیں، اِن کے لئے ماتا سے کیا التجا کی جائے!" اس کے بجائے انھوں نے یہ دُعا کی: "ماتا! میں علم اور یقین کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔"

اس دن سے ان کی ایک نئی زندگی شروع ہو گئی۔ انھیں علم ہو گیا اور وہ یقین کرنے لگے اور اُن کا عقیدہ جو گوئٹے کے بر لبط نواز[۱] کی طرح تباہ حالی میں پیدا ہوا تھا، آنسوؤں میں تر کی ہوئی روٹی کے مزے کو کبھی نہ بھولا، نہ اپنے اُن مُصیبت زدہ بھائیوں کو جنھیں روٹی کے یہ ٹکڑے ملے تھے۔ دل کی ایک رفیع آواز دُنیا کے سامنے اُن کے عقیدے کا اعلان کرتی تھی:

"جس خدا پر میرا ایمان ہے وہ تنہا وہی خدا ہے جو تمام رُوحوں کا مجموعہ ہے اور اس سے بھی بڑھ کر میں اس خدا پر یقین رکھتا ہوں جو ظالم ہے، پریشان حال ہے، میرا خدا تمام دنیا کے غریب ......"

مسیح گلیلی کی فتح ہو گئی تھی۔[۲] بنگال کے شفیق گرو نے اُن کے غرور کی قوّتِ مدافعت کو شکست دے دی تھی۔ مستقبل میں اس عظیم چھتری سے زیادہ فرمانبردار اُن کا اور کوئی شاگرد نہ تھا، وہ چھتّری جو حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اُن کا اتحاد اتنا مکمل ہو گیا

---

[۱] وِلہلم ماَئسٹر میں گوئٹے کے بعض بہت حسین نغموں کی طرف اشارہ ہے، یُورپ کے بہترین موسیقاروں شوبرٹ اور ہیوگو وولف وغیرہ نے جن کی دُھنیں تیار کی تھیں۔

[۲] شہنشاہ جولین کی چیخ جو مرتے وقت اُس کے منھ سے نکلی، وہ مسیح کے خلاف بے نتیجہ نبرد آزما رہا۔

کہ بعض اوقات ایک دوسرے سے پہچانا جاتا تھا۔ اس طرح قابو میں لائی ہوئی روح پر کچھ اصلاحی اثرات ڈالنا ضروری تھا جو اعتدال جانتی ہی نہ تھی۔ رام کرشن کو ان خطرات کا علم تھا جن میں وہ گھری ہوئی تھی۔ اس کا ان گڑھ اور پرہیجان طریق کار یہ تھا کہ وہ علم سے محبت تک اور دھیان کی ضرورت سے عمل کی ضرورت تک جست لگاتی تھی۔ وہ ہر چیز کو ایک ہی وقت میں اپنے اندر لے لینا چاہتی تھی۔ یہ ہم اکثر دیکھیں گے کہ رام کرشن کے آخری دنوں میں نرن گرو سے اصرار کرتے تھے کہ وہ ان کو اعلیٰ ترین اور شعور سے برتر مراقبہ یعنی نرودی کلپ سمادھی کی اجازت دے دیں جس سے واپسی نہیں ہوتی لیکن رام کرشن سختی سے انکار کرتے رہے۔

ایک دن سوامی شیوا آنند نے مجھ سے کہا کہ وہ کلکتہ کے قریب کاشی پور کے ایک باغ میں اس وقت خود بھی موجود تھے جب نرن پر یہ کیفیت طاری ہو گئی۔ "انھیں بیہوش دیکھ کر اور ان کے جسم کو مردوں کی طرح ٹھنڈا پا کر ہم لوگ دوڑے ہوئے گرو کے پاس گئے اور انھیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ گرو نے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ صرف مسکرائے اور بولے، ٹھیک ہے! اور خاموشی کے مراقبہ میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد نرن کو ظاہری ہوش آیا اور وہ گرو کے پاس آئے۔ گرو نے اُن سے کہا! "کیوں؟ اب تم سمجھے؟ یہ (جذب کی اعلیٰ ترین حالت) اب مقفّل رہا کرے گی۔ تمھیں ماتا کا کام کرنا ہے، جب وہ کام ختم ہو جائے گا تو وہ قفل کھول دیں گی۔" نرن نے جواب دیا: "گرو! ایسی سمادھی میں، بیحد خوش تھا۔ اپنی لامحدود مسرت میں دُنیا کو بھول گیا تھا، میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے اسی حالت میں رہنے دیجئے!" گرو نے چیخ کر کہا: "شرم کرو! تمھیں ایسی چیز مانگنے کی ہمّت کیونکر ہوئی۔ میں سمجھتا تھا کہ تم زندگی کا ایک بڑا خزانہ ہو اور تم ہو کہ ایک عام آدمی کی طرح اپنی ذاتی خوشی میں کھوئے رہنا چاہتے ہو!...... ماتا کے فیض سے یہ حالت تمھارے لئے اتنی فطری ہو جائے گی

کہ تم اپنی عام حالت میں بھی تمام چیزوں میں ایک وحدت کا احساس کر سکو گے۔ تم دنیا میں بڑے بڑے کام انجام دو گے، انسانوں میں روحانی بیداری پیدا کرو گے اور کمزوروں اور غریبوں کا دکھ دور کرو گے۔"

رام کرشن نے دیکھ لیا تھا کہ وویکانند کسی کام کے لئے سانچے میں ڈھالے گئے ہیں اور ان کی مرضی کے خلاف انھیں اس کے کرنے پر مجبور کیا۔

انھوں نے کہا: "عام لوگ دنیا کو تعلیم دینے کی ذمہ داری لینے سے ڈرتے ہیں۔ لکڑی کا ایک معمولی ٹکڑا پانی کی سطح پر صرف تیر سکتا ہے، اگر اس پر کوئی چڑیا بیٹھ جائے تو وہ ڈوب جاتا ہے لیکن نرین دوسرے قسم کے انسان ہیں، وہ ایک درخت کے بڑے تنے کی طرح ہیں جو انسانوں اور جانوروں کو اپنے اوپر لاد کر گنگا پر لے جاتا ہے۔"

انھوں نے اس دیو پیکر شخصیت کی پیشانی پر سینٹ کرسٹوفر[1] (انسانوں کو اٹھانے والے) کا نشان دیکھ لیا تھا۔

. . . . . .

١٨٨٥ء میں رام کرشن کی صحت بہت بگڑ گئی۔ ایک دن جذب کے عالم میں ان کے بائیں ہاتھ کی ہڈی اتر گئی اور درد کی شدید تکلیف شروع ہو گئی۔ ان میں زبردست تبدیلی پیدا ہو گئی۔ انھوں نے اپنے بیمار جسم اور سیلانی روح کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا۔ اب وہ "میں" کی بات نہیں کرتے تھے

---

[1] اس میں ایک عیسائی روایت سینٹ کرسٹوفر کی طرف اشارہ ہے (جس کے نام کا مطلب ہے مسیح کو اٹھانے والا۔ یہ ایک دیو تھا) وہ لوگوں کو اپنے کاندھے پر بٹھا کر دریا پار کراتے تھے۔ ایک دن اپنے بچپن میں مسیح ان کے پاس آئے (دیکھئے رومیں رولاں کی ژاں کرسٹوف کا آخری حصہ)

اپنے متعلق "مجھ کو" نہیں کہتے تھے بلکہ "یہ" سے منسوب کرتے تھے۔

اگلے سال اپریل میں اُن کے گلے کے اندر سوجن ہوگئی۔ یقیناً اس کا سبب مسلسل بات کرنے کی تھکن اور وہ خطرناک سمادھیاں تھیں جن سے خون حلق میں دورہ کرتا تھا۔ جن ڈاکٹروں سے انھوں نے مشورہ کیا انھوں نے تقریر اور سمادھی دونوں سے روکا لیکن انھوں نے اُن کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ایک بہت بڑی ویشنوی تقریب میں انھوں نے حد سے زیادہ اپنے کو تھکایا، نتیجہ یہ ہوا کہ بیماری اور بڑھ گئی۔ اُن کے لئے کچھ کھانا عملاً ناممکن ہو گیا۔ اس کے باوجود وہ اُن تمام لوگوں سے ملتے رہتے جو دن رات اُن کے پاس آیا کرتے تھے۔ ایک رات کو اُن کے حلق کی رگیں پھٹ گئیں۔ ڈاکٹروں نے کینسر تجویز کیا۔ ان کے خاص خاص شاگردوں نے اصرار کر کے انھیں اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے کلکتے کے ڈاکٹر مہندر لال سرکار کے زیر علاج رہیں ستمبر ۱۸۸۵ء میں ایک مختصر سا مکان کرایہ پر لے لیا گیا جہاں رام کرشن کی اہلیہ نے ایک حصّہ گھریلو کاموں کی ضروریات کے لئے الگ کر لیا۔ سعادت مند شاگرد رات کو ان کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ان کی اکثریت غریب تھی، انھوں نے اپنی چیزیں رہن کر کے، قرض لے کر اور سامان گروی رکھ کے گرو کے علاج کے لئے پیسے جمع کئے۔ اس سے ان کے درمیان اتحاد اور مضبوط ہوا۔ ڈاکٹر سرکار عقلیت پرست تھے اور رام کرشن کے مذہبی خیالات سے متفق نہیں تھے، اس کا اظہار انھوں نے صاف صاف کر دیا تھا لیکن جیسے جیسے وہ اپنے مریض سے واقف ہوتے گئے ان کے دل میں ان کی عزت بڑھتی گئی یہاں تک کہ وہ اُن کا علاج مفت کرنے لگے۔

رام کرشن کی حالت خراب ہوتی گئی۔ ڈاکٹر سرکار نے مشورہ دیا کہ انھیں کلکتہ سے ہٹا کر کہیں دیہات میں رکھا جائے۔ دسمبر ۱۸۸۵ء کے وسط میں انھیں کاشی پور کے خوبصورت

بالغوں کے درمیان میں پہنچا دیا گیا اور وہیں انھوں نے اپنی دنیوی زندگی کے آخری آٹھ مہینے گزارے۔ ان کے بارہ منتخب شاگردوں نے آخر وقت تک اُن کا ساتھ دیا۔ نرن ان کی عبادتوں اور دوسرے کاموں کی نگرانی کرتے تھے۔ وہ گرُو سے التجا کرتے تھے کہ وہ اپنی صحت کے لئے ان کی دعاؤں میں شریک ہوں، اس منت وسماجت میں اُس وقت اور جان آگئی جب ایک پنڈت، نے جو ان لوگوں کے ہم عقیدہ تھے، رام کرشن سے یہ کہا کہ "مذہبی صحائف میں لکھا ہوا ہے کہ آپ کے ایسے رشی محض اپنی قوتِ ارادی سے خود کو صحت یاب کر سکتے ہیں"۔

رام کرشن نے جواب دیا: "میں نے اپنا ذہن ہمیشہ کے لئے خدا کے حوالے کر دیا ہے، کیا تم یہ پسند کرو گے کہ میں اُسے دوبارہ واپس مانگوں؟"

اُن کے شاگرد انھیں اس بات پر بُرا بھلا کہتے تھے کہ وہ اپنی صحت بحال کرنے کی خواہش نہیں کرتے۔ رام کرشن نے کہا: "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں خود سے بیمار ہوں؟ میں اچھا ہونا چاہتا ہوں لیکن اس کا انحصار ماتا پر ہے"۔

"پھر اُن سے دعا کیجئے"۔

"تمھارے لئے کہنا آسان ہے لیکن میں یہ الفاظ اُن سے نہیں کہہ سکتا"۔

نرن نے ملتجی انداز میں کہا: "ہماری خاطر سے کہئے!"

گرُو نے نرمی سے جواب دیا: "اچھا! میں جو کچھ کر سکتا ہوں اس کی کوشش کروں گا"۔ شاگردوں نے انھیں کئی گھنٹوں کے لئے تنہا چھوڑ دیا، جب واپس آئے تو رام کرشن نے کہا، "میں نے اُن سے کہا، ماتا! میں تکلیف کی وجہ سے کچھ کھا نہیں سکتا۔ ایسا کر دیجئے کہ میں کچھ کھا سکوں! انھوں نے تمھاری طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا، کیا تم ان

لوگوں کے منھ سے نہیں کہا سکتے؟" میں شرمندہ ہوگیا اور پھر مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا۔"
کئی دن کے بعد انھوں نے کہا: "میری تعلیم ختم ہوگئی، اب میں لوگوں کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا کیونکہ مجھے ساری دنیا خدا سے بھری ہوئی نظر آرہی ہے، اس لئے میں خود سے پوچھتا ہوں، میں اب کسے تعلیم دے سکتا ہوں؟"

پہلی جنوری ۱۸۸۶ء کو انھوں نے کچھ افاقہ محسوس کیا اور باغ میں چند قدم ٹہلے۔ وہیں انھوں نے اپنے شاگردوں کو برکت کی دعا دی۔ ان کی دعاؤں کے اثرات کئی شکلوں میں ظاہر ہوئے، کبھی پرسکون وجد کی صورت میں اور کبھی مسرت کی پرشور ترنگوں کی شکل میں۔ لیکن اس بات پر سب متفق تھے کہ جیسے انھیں برقی رو کے چھو جانے کا احساس ہوا، کوئی قوت ہاتھ آئی، جس سے ہر ایک نے اپنے پسندیدہ آدرش کی حدوں کو پالیا۔

صرف نرن ایسے تھے جو غیر آسودہ رہے۔ والد کا انتقال، دنیا کی فکریں اور دل کی آگ ایسی چیزیں تھیں جو انھیں کھائے جا رہی تھیں۔ انھوں نے دیکھا کہ سب کامیاب ہو گئے، وہی چھوٹ گئے۔ ان کے کرب کا کوئی جواب نہ ملتا تھا اور خوشی کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی۔ انھوں نے رام کرشن سے التجا کی کہ انھیں ان الجھنوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے کئی دن کی سمادھی (مراقبہ) کی اجازت دیں لیکن گرو نے سختی سے جھڑک دیا (وہ مروت اور شفقت ان کے لئے رکھتے تھے جن سے انھیں سب سے کم کچھ پانے کی امید ہوتی تھی) اور ایسے "ذلیل خیالات" رکھنے پر بہت ملامت کی۔ (ان کا خیال تھا کہ) اگر وہ اپنے خاندان کے لئے کچھ انتظام کر لیں تو ان کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور پھر وہ سب کچھ حاصل کر لیں گے۔ نرن ایک کھوئی ہوئی بھیڑ کی طرح فریاد کرنے لگے اور

کلکتہ سے بھاگ نکلے، کھیتوں میں ہوتے ہوئے ایک کھلیان میں گر پڑے، جہاں مٹی اور تنکوں میں لت پت ہو گئے۔ وہ کراہتے تھے اور اس کو حاصل کرنے کی آگ میں جل رہے تھے جس تک رسائی دشوار ہے۔ ان کی رُوح کو سکون نہ تھا۔ رام کرشن دُور بیٹھے اُن کے شوریدہ سر سفر کو شفقت اور ترحّم سے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ اس ربّانی شکاری کو تھک کر رُک جانے سے پہلے اس کی (روحانی سکون کی) خوشبو ضرور ملنا چاہیئے۔ وہ اس کو محسوس کرتے تھے کہ نرین کا معاملہ قابلِ غور ہے کیونکہ اپنی بے اعتقادی کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود وہ خدائے مطلق کے لئے بیقرار تھے۔ وہ جس حد تک آزما چکے تھے اسی کی نسبت سے رام کرشن انھیں متبرک سمجھتے تھے۔ وہ دوسرے شاگردوں کے سامنے ان کے چہرے کو چھپاتے تھے۔ وہ اُن میں بھگتی (محبت کے ذریعہ عرفان) کی تمام علامتیں پاتے تھے۔ گیانیوں (رُوح کے علم کی بنیاد پر ایمان لانے والے) کے برعکس بھگت مُکتی (نجات) کی خواہش نہیں کرتے۔ انسان کی بھلائی کے لئے وہ بار بار جنم لیتے ہیں کیونکہ وہ انسانوں کی محبّت اور خدمت کے لئے بنے ہیں۔ جب تک خواہش کا ایک ذرہ بھی باقی رہے گا وہ پھر پیدا ہوں گے۔ جب انسان کے دل کی تمام خواہشیں ختم ہو جائیں گی تب آخر میں وہ مکتی حاصل کریں گے۔ لیکن بھگت خود اس کی خواہش اپنے لئے کبھی نہیں کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ شفیق گرو، جن کا دل تمام مخلوق کی پناہ گاہ تھا اور کسی وقت بھی انھیں فراموش نہیں کر سکتا تھا، ہمیشہ بھگتوں کو ترجیح دیتے تھے، نرین ان میں سب سے زیادہ عظیم المرتبت تھے۔

انھوں نے کبھی اس بات کو پوشیدہ نہیں رکھا کہ وہ نرین کو اپنا وارث سمجھتے ہیں۔ ایک دن انھوں نے ان سے کہا: "میں ان تمام نوجوانوں کو تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ ان کی رُوحانی قوتیں بڑھانے میں مصروف ہو جاؤ۔"

اور اس راہبانہ زندگی کے لئے تیار کرنے کی غرض سے انھوں نے انھیں حکم دیا کہ وہ ذات پات کا لحاظ کئے بغیر در در پھر کر اپنے لئے کھانا مانگیں۔ مارچ کے خاتمہ کے قریب انھوں نے انھیں زعفرانی لباس عنایت کیا جو سنیاسی ہونے کی علامت تھا اور راہبانہ زندگی میں داخلہ کا نشان۔

خود نرین نے ترک علائق کی مثال دنیا میں قائم کی لیکن اپنی روحانی منزلت کا انھوں نے بڑی مشکل سے تیاگ کیا۔ اگر شیطان نے (حضرت عیسیٰ کی طرح) انھیں بھی دنیا کی بادشاہت دینے کا وعدہ کیا ہوتا تو اُسے کوئی فائدہ نہ ہوتا لیکن اگر عالمِ روحانی پر اختیار دینے پر آمادگی ظاہر کرتا تو اُن کی نیت میں ضرور فتور آجاتا۔ ایک دن نرین نے اپنی روحانی قوت کو آزمانے کے لئے اپنے ایک ساتھی کالی پرشاد سے کہا کہ جس وقت میں مراقبہ میں ہوں مجھے چھونا، کالی پرشاد نے انھیں چھوا اور فوراً خود بھی اسی حالت میں پہونچ گیا۔ رام کرشن نے اسے سُنا تو نرین کو بڑی ملامت کی کہ وہ اپنا بیج محض کمتر درجہ کے مقصد حاصل کرنے کے لئے زمین میں ڈالتے ہیں اور نہایت قطعیت کے ساتھ خیالات کو ایک سے دوسرے تک پہنچانے کے اس طریقہ کی مذمت کی مکمل روحانی آزادی کے خلاف کچھ کرنا قابلِ لعن ہے، تمھیں دوسروں کی مدد کرنا چاہئے لیکن اس طرح نہیں کہ تم اُن کے خیالات کو اپنے خیالات میں بدل دو۔

نرین سمادھی میں تھے کہ تھوڑی دیر بعد انھیں اپنے سر کے پیچھے ایک روشنی کا احساس ہوا اور وہ خدائے مطلق میں تحلیل ہو گئے۔ وہ نروی کلپ سمادھی کی خوفناک گہرائیوں میں غرق ہو گئے جس کی انھیں بہت دنوں سے تمنا تھی اور جس کی اجازت رام کرشن نہیں دیتے تھے جب بڑی دیر کے بعد وہ اپنے آپ میں آئے تو انھیں ایسا معلوم ہوا کہ اب اُن کے

پاس جسم نہیں صرف چہرہ ہے'، وہ چلا اُٹھے : "میرا جسم کہاں ہے؟" دوسرے ساتھی خوفزدہ ہو گئے اور بھاگ کر گرو کے پاس گئے، رام کرشن نے آہستگی سے کہا: "اچھا ہے۔ تھوڑی دیر انھیں اس حالت میں رہنے دو! اس کے لئے انھوں نے مجھے بہت پریشان کیا تھا۔"

جب نرن پھر زمین پر آ گئے تو وہ ناقابلِ بیان سکونِ قلب میں غرق تھے۔ گرو کے پاس گئے تو رام کرشن نے اُن سے کہا: "ماتا نے اب تمھیں ہر چیز کا مظاہرہ کرا دیا ہے۔ لیکن یہ مکاشفہ اب مقفّل رہے گا جب تم ماتا کی خدمت کرو گے تو اس خزانے کو پاؤ گے۔"

انھوں نے نرن کو بتایا کہ انھیں آنے والے دنوں میں اپنی صحت کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

جس قدر اُن کے دن قریب آتے جاتے تھے وہ بے تعلق ہوتے جاتے تھے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں کے غم پر اپنی پرسکون مسرّت کا دامن پھیلا دیا۔

وہ لوگ نہیں معلوم تھا کہ ان کا یہ مرض الموت (حلق کا کینسر) کتنا خطرناک ہے، وہ اُن کی اس محبّت آمیز اور مشفقانہ مسکراہٹ پر تعجّب کرتے تھے جو کسی وقت اُن کے چہرے سے جدا نہ ہوتی تھی۔ اگر انھیں، ہندوستانی مقلّدوں کے اس مسیح کو، صلیب کی شاندار موت نصیب نہیں ہوئی تو یہ جاننا چاہئے کہ اُن کا بسترِ مرگ کسی طرح صلیب سے کم نہ تھا۔ پھر بھی اُن کی زبان سے یہ نکلا: "صرف جسم تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے، جب دماغ خدا سے مل جاتا ہے وہ کسی قسم کا درد محسوس نہیں کر سکتا۔"

اور پھر کہا: "جسم اور اس کی تکالیف کو ایک دوسرے سے اُلجھنے دے، اے میرے دماغ تو سکون میں رہ! اب میں اور میری ربّانی ماتا ہمیشہ کے لئے ایک ہو گئے ہیں۔"

مرنے سے تین چار دن پہلے انھوں نے نرن کو بلایا اور ان کے ساتھ تنہا رہنے کی

خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے محبّت بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا اور عالم جذب میں چلے گئے۔ اس نے نرن کو اپنے احاطہ میں لے لیا جب وہ اس سے باہر نکلے تو دیکھا کہ رام کرشن کے آنسو بہہ رہے ہیں۔ گرو نے کہا: "آج میں نے اپنا سب کچھ تمھیں دے دیا، اب میں ایک مفلس فقیر ہوں، جس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس قوّت سے تم دنیا میں بہت کچھ کروگے اور جب تک اس کام کو تکمیل نہیں ہو جائے گی تم واپس نہیں آؤگے۔"

اُس لمحہ سے اُن کی تمام قوتیں نرن میں منتقل ہو گئیں۔ گرو اور چیلا ایک ہو گئے۔

آخری دن .... اتوار ۱۵ اگست ۱۸۸۶ء

شام کو اُن کے اندر تقریباً معجز نما قوّت تھی کہ وہ زخمی حلق کے باوجود اپنے شاگردوں سے دو گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ رات کو بیہوش ہو گئے اور لوگوں نے سمجھا کہ ان کا انتقال ہو گیا لیکن آدھی رات کے قریب اُن میں حرکت پیدا ہوئی، پانچ چھ تکیوں کی مدد سے اور اپنے ایک سعادتمند شاگرد رام کرشنانند کے جسم کا سہارا لے کر اپنے آخری لمحوں تک اپنے محبوب شاگرد نرن سے باتیں کرتے اور بہت دھیمی آواز میں آخری مشورے دیتے رہے۔ تب ایک گونجتی ہوئی آواز میں انھوں نے اپنی محبوب کالی، ربّانی ماتا کا نام لیا اور سر ڈھلک گیا۔ آخری عالمِ جذب طاری ہوا اور وہ مرنے سے قبل دوپہر کے کوئی آدھ گھنٹہ پہلے تک اسی میں رہے۔ اپنے ہی روحانی الفاظ میں، "وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔"

اور اُن کے شاگرد چلائے "جے ہو!"

• • • • • •

حواریوں کی فوراً ایک جماعت بن گئی کیونکہ نوجوان شاگردوں کو جنھوں نے اُن کی زندگی کے آخری دن دیکھے تھے، پھر دُنیا میں واپس جانا ناممکن معلوم ہوا۔ اُن کے پاس کچھ نہ تھا لیکن

چار شادی شدہ شاگردوں نے اُن کی ہمّت افزائی کی اور ایک آشرم قائم کرنے میں مدد دی۔ ان شاگردوں میں سریندر ناتھ مترا، مہندر ناتھ گپت، گریش چندر گھوش، سابق مزاحیہ اداکار اور بلرام بوس تھے جنھیں وقتی طور پر رام کرشن کے تبرکات کا امین بنا دیا گیا تھا۔ سریندر ناتھ مترا نے گنگا کے کنارے بارنا گور میں ایک نیم افتادہ مکان کرایہ پر لینے کے لئے پیسے فراہم کئے۔ یہی شاگردوں کا پہلا مٹھ یا آشرم قرار پایا۔ ایک درجن یا کچھ زیادہ شاگرد اپنے راہبانہ ناموں کے ساتھ وہاں یکجا ہو گئے۔ اُن کے اصل نام بعد کی نسلوں سے پوشیدہ ہی رہے۔ نرین، جو ہمیشہ کے لئے وویکانند ہیں، اتفاق رائے سے اُن کے سربراہ بن گئے۔ وہ سب سے زیادہ باعمل، سب سے زیادہ پُر قوّت اور سب سے زیادہ ذہین تھے اور گرو نے بھی اُنھیں کو نامزد کیا تھا۔ دوسرے شاگردوں کو یہ اچھا معلوم ہوا کہ وہ گوشہ نشین ہو جائیں اور یادوں اور غموں کی نشہ آور مدہوشی کے نیچے خود کو دفن کر لیں لیکن اس عظیم المرتبت شاگرد نے جو تمام تجربات سے اُن سے زیادہ واقف تھا اور اس راہ کے خطروں سے آگاہ تھا، اپنا سارا وقت ان کی تعلیم اور ہدایت میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ ان تارکانِ دنیا کے درمیان وہ آگ کے ایک طوفان کی حیثیت رکھتا تھا، اُس نے انھیں غم اور جذب کی دنیا سے باہر نکالا، انھیں بیرونی دنیا کے خیالات سے واقفیت حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ اس نے انھیں اپنی زبردست ذہانت کی خوشگوار بارش سے تر کر دیا، اس نے اُن کو علم کی تمام شاخوں مثلاً مذاہب کا تقابلی مطالعہ، سائنس، تاریخ، عمرانیات کے سیکھنے پر اُکسایا کیونکہ وہ اُن میں آفاقی تناظر پیدا کرنا چاہتا تھا۔ مقدس شعلہ کو ایک لمحے کے لئے بھی سرد کئے بغیر اُس نے انھیں مُفید مباحثوں میں شریک کیا۔

یہ کرسمس ۱۸۸۶ء کا علامتی زمانہ تھا جب ان انسانی دیوتاؤں کی پیدائش کے قانون پر دستخط کئے گئے اور مہر ثبت ہوئی۔ داستان دلچسپ ہے کیونکہ اس میں اس رات

مغرب کے "خدائے جمیل"[1] اور ہندوستان کی آواز کے درمیان ایک اتفاقی مقابلہ کا دلکش بیان پوشیدہ ہے۔

یہ لوگ انت پور میں بابو رام شاگرد کی ماں کے مکان پر جمع تھے۔

"اچھی خاصی شام ہو چکی تھی جب یہ سارے سادھو آگ کے گرد جمع ہوئے۔ یہ لوگ لکڑیوں کے بڑے بڑے کندے لائے تھے اور ان میں آگ لگا دی تھی۔ ذرا سی دیر میں بھڑکتے ہوئے شعلے بلند ہونے لگے اور رات کے اندھیرے سے ایک حسین تقابل پیدا ہو گیا۔ اوپر ہندوستان کی سیاہ رات کا شامیانہ تنا ہوا تھا، چاروں طرف دیہاتی سنّاٹے کا ناقابلِ بیان سکون چھایا ہوا تھا۔ بڑی دیر تک مراقبوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد ذرا دیر کے لئے وقفہ ہوا۔ سرگروہ ویویکانند نے خاموشی کی فضا عیسیٰ مسیح کی کہانی شروع کر کے توڑی۔ بالکل شروع سے یعنی پُر اسرار اور عجیب پیدائش کے قصّے سے ابتدا کی۔ جب اس منجی کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تو سارے بیراگی کنواری مریم کے ساتھ سعادت مسرّت سے بھر گئے .... مسیح کے بچپن میں یہ لوگ اُن کے ساتھ رہے، اُن کے مصر ہجرت کرنے میں ساتھ رہے، وہ اُس ہیکل میں اُن کے ساتھ رہے اور سوال جواب سنتے رہے۔ جہاں یہودی کاہنوں نے انھیں گھیر لیا تھا، وہ اس وقت بھی ان کے ساتھ رہے جب مسیح نے اپنے پہلے شاگردوں کو جمع کیا۔ انھوں نے ان کی ویسی ہی عزّت کی جیسی کہ وہ خود اپنے گرو کی کرتے تھے۔ مسیح اور رام کرشن کے درمیان خیال اور عمل میں یکسانیت کے بہت سے پہلوؤں اور

---

[1] فرانسیسی متن میں (Beau Dieu) کے لغوی معنی ہیں "خوبصورت خدا" فرانسیسی مسیح کے مشہور مجسّمہ کو جو امینس کے گرجا گھر کے دروازے پر نصب ہے، اسی نام سے پکارتے ہیں۔

شاگردوں کے ساتھ تعلقات کی یک رنگی نے اُن کے ذہنوں میں اُن گذرے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کردی جب وہ گرُو کے ساتھ عالمِ وجد میں تھے۔ نجات دہندہ مسیح کے الفاظ اُن کے کانوں میں مانوس اقوال کی طرح گونجنے لگے۔"

اس کے بعد وویکانند نے ان سے اپیل کی۔ انھوں نے اُن سے التجا کی کہ وہ اپنی اپنی جگہ پر مسیح بنیں، دُنیا کو نجات دلانے کی کوشش کریں، ہر چیز سے ترک تعلق کرلیں، جیسے مسیح نے کہا تھا اور خدا کو حاصل کریں۔ آگ کے سامنے کھڑے ہوکر، جب کہ ان کے چہرے لپکتے ہوئے شعلوں کی ضو سے سُرخ ہو رہے تھے اور اُن کے خیالات کے سنّاٹے میں صرف لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز سُنائی دے رہی تھی، انھوں نے سچّے دل سے اپنے ساتھیوں کے سامنے اور خدا کے حضور میں دائمی سنیّاس کا عہد کیا۔

پہلے نہیں بلکہ جب اُن سارے کاموں کی تکمیل ہوچکی تو اُن سادھوؤں کو یاد آیا کہ یہ کرسمس کی رات تھی۔ ایک نئے ربّانی دن کی پیدائش کے اعلان کی زبردست اہمیت کی طرف خوبصورت اشارہ !......

ابتدا ہی سے اس نئے مسلک میں کچھ عجیب خصوصیات تھیں۔ اس کے اندر صرف مشرق اور مغرب کے عقائد کی مشترکہ قوتیں نہیں تھیں، یہ صرف علوم کے قاموسی مطالعہ اور مذہبی مراقبہ میں اتحاد پیدا کرنے والا نہیں تھا بلکہ اس میں غور و فکر کے آدرش کو انسانی خدمت کے آدرش میں ملادیا گیا تھا۔ ابتدا ہی سے رامکرشن کے اِن رُوحانی فرزندوں نے یہ نہیں کیا تھا کہ خود کو خانقاہوں کی چہار دیواری میں بند کرلیں۔ ایک کے بعد ایک نکلا اور اس نے دریوزہ گر بیراگیوں کی طرح دُنیا کا سفر کیا۔

———:(۵):———

پرمی وراجک

(سیلانی رُوح کو بھرتی کی پکار)

اننت پور میں ۱۸۸۶ء کی کرسمس رات کی شب بیداری کے بعد جہاں حواریوں کی نئی جماعت کی بنیاد گرو کی یاد میں بہائے ہوئے آنسوؤں کے درمیان پڑی تھی، قبل اس کے کہ رام کرشن کے خیالات کو زندہ عمل میں تبدیل کیا جائے، اسے کئی مہینے اور سال گزر گئے۔

ایک پُل بنانا تھا اور ابتدا میں وہ یہ طے نہ کر سکے کہ بنائیں یا نہ بنائیں۔ اس جماعت میں قوّتِ عمل اور تعمیری صلاحیت تنہا نرن کے اندر تھی، وہ بھی تذبذب میں تھے۔ دوسروں کے مقابلہ میں وہ سب سے زیادہ خیال اور عمل کی زبردست کشمکش میں مبتلا تھے۔ قبل اس کے کہ وہ محراب کھڑی کریں جو دونوں کناروں کو ملائے، ان کے لئے دوسرے کنارے سے اچھی طرح واقف ہونا بھی ضروری تھا، (یہ دونوں کنارے تھے:) ہندوستان کی اصلی دنیا اور موجودہ عہد۔ لیکن ابھی تک کوئی بات واضح نہ تھی۔ مستقبل کے اس نوجوان کے حرارت خیز دل میں آنے والے کاموں کی دھیمی آگ سلگ رہی تھی، اس کی عمر ابھی کل تیئیس ۲۳ سال کی تھی اور کام بہت بھاری، بہت پیچیدہ اور بہت وسیع تھا! یہ محض خیال میں بھی کس طرح پورا ہو سکتا تھا! اُسے کب اور کہاں سے شروع کرنا چاہیے؟ اسی اُلجھن میں انھوں نے اس تحریک کو

ملتوی رکھا۔ لیکن کیا وہ اپنے ذہن کی پوشیدہ گہرائیوں میں بھی اس کے زبردست بحث و مباحثہ کو روک سکتے تھے؟ جس نے ابتدائے جوانی سے شعوری نہیں غیر شعوری طور پر، اُن کی فطرت کے اندر متصادم جذبات اور متصادم خواہشات بن کر، ہر رات اُن کا تعاقب کیا تھا۔ یہ خواہشیں فتح مندی حاصل کرنے، زمین پر اقتدار اور اختیار رکھنے کی بھی تھیں اور سارے دنیوی تعلقات کو تیاگ کر خدا کو حاصل کرنے کی بھی۔

یہ جنگ ساری زندگی بار بار ان کے اندر ہوتی رہی۔ یہ بہادر اور فاتح ہر چیز چاہتا تھا؟ دنیا بھی اور خدا بھی، دنیوی اقتدار بھی اور تیاگ بھی۔ اُن کے رُومنوں جیسے ورزشی جسم کی مفرط طاقت اور فاتحانہ دماغ دونوں اقتدار کے لئے جد و جہد میں مصروف تھے۔ لیکن قوت کی اس زیادتی نے یہ بات ناممکن بنادی کہ طوفان خیز پانی ربانی دریا کے سوا کسی اور دریا میں ٹھہر سکے، گویا اس طرح اپنے کو وحدت کے کامل اختیار میں سونپ دے۔ تمکنت اور محبت کی زبردست خواہشات کا فیصلہ کس طرح ہو، جو دو رقابت اور قدرت رکھنے والے بھائیوں کی طرح تھیں؟

ایک تیسرا عنصر بھی تھا جسے خود نرن نے نہیں دیکھا تھا لیکن رام کرشن کی ہمہ بیں نگاہوں نے دیکھ لیا تھا۔ جس وقت کہ لوگ اس نوجوان کے متعلق بے اعتنادی کی کیفیت کا اظہار کر رہے تھے، جس کے اندر یہ شور انگیز قوتیں سرگرم کار تھیں، گرو نے کہا تھا:

"جس دن نرن کو مصائب اور تکالیف سے سابقہ پڑے گا، اُن کا فطری غرور لامحدود محبت کے جذبے میں تبدیل ہو جائے گا۔ اپنی ذات پر زبردست اعتماد اُن کے لئے اس حربہ کا کام دے گا جو شکست خوردہ روحوں میں پھر سے وہ اعتماد اور یقین واپس لاتا ہے جسے وہ کھو چکے ہیں، اور اُن کے طریق کار کی آزادی جو اپنے اوپر زبردست قابو رکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے دوسروں کی نگاہوں میں ذاتِ حق کی آزادی کا مظہر بن کر چمکے گی۔"

مصائب اور انسانی پریشاں حالی کی ٹکّر نے، جو مبہم اور غیر معیّن نہیں تھی بلکہ واضح اور سامنے تھی، لوہے پر چقماق کا کام دیا، جس سے ایک چنگاری نکل کر ساری رُوح میں آگ لگا گئی، یہ پریشاں حالی اپنے ہموطنوں کی اور ہندوستان کی تھی۔ یہی ایک سنگِ بنیاد بن گئی۔ غرور، حوصلہ محبّت، یقین، سائنس اور عمل، یعنی ان کی ساری قوتیں اور ساری خواہشات انسانی خدمت میں لگ گئیں، سب متحد ہو کر ایک شعلہ بن گئیں ...... (بعد میں انھوں نے کہا:) یہ ایک ایسا مذہب ہو گا جو ہم میں اپنے اُوپر یقین پیدا کرے گا، قومی خودداری کا احساس پیدا کرے گا اور جو غریبوں کو تعلیم اور خوراک دینے اور گرد و پیش پھیلی ہوئی پریشاں حالی کو دُور کرنے کی طاقت پیدا کرے گا اگر تم خدا کو پانا چاہتے ہو تو انسان کی خدمت کرو!"

لیکن اپنے مشن کے متعلق یہ شعور سالہا سال کے بلاواسطہ تجربوں کے بعد پیدا ہوا۔ انھوں نے انسانیت کے اُس پُرعظمت لیکن زبوں حال جسم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے ہاتھوں سے چھوا۔ یہ اُن کی بھارت ماتا کا جسم تھا، اپنی المناک عریاں حالت میں!

ہم اُن کی سالہا سال مارے مارے پھرنے کی یاترا میں اُن کے ساتھ ساتھ رہیں گے۔

* * * * * *

بارنا گور کے پہلے سال کے ابتدائی مہینے شاگردوں کے درمیان روحانی بلندی حاصل کرنے میں صرف ہوئے۔ ابھی تک اُن میں سے کوئی بھی لوگوں کے درمیان جا کر وعظ کہنے پر آمادہ نہ تھا۔ اُن کی خواہش تھی کہ وہ اپنی ساری توجہ حصولِ معرفت پر مرکوز کر دیں، باطنی زندگی کی مسرتیں اُنھیں ظاہری دنیا سے دُور ہٹا رہی تھیں۔ نرن بھی لامحدود کی معرفت حاصل کرنے کے جذبے میں اُن کے شریک تھے لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ یہ مثبت یا نہ کشش انفعالی رُوح کے لئے کتنی خطرناک ہے، یہ چیز گرتے ہوئے پتھر کے لئے کششِ ثقل کا کام کرتی ہے۔ نرن، جن کے لئے خواب دیکھنا بھی عمل کی

حیثیت رکھتا تھا، انھیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے تھے کہ وہ بے حسی کے ساتھ مراقبہ میں غرق ہو جائیں۔ انھوں نے خانقاہی گوشہ نشینی کے اس زمانے کو پُرشفقت تعلیمِ رُوح کے لئے اعلیٰ تعلیم کا مرکز بنا دیا۔ اگرچہ ان میں سے بعض اُن سے عمر میں بڑے تھے لیکن ذہانت کی برتری اور علم نے ابتدا ہی سے انھیں اپنے ساتھیوں کا خاموش لیکن تسلیم شدہ رہنما بنا دیا تھا۔ کیا جب وہ آخری بار گرُو سے رخصت ہو رہے تھے تو ان کے آخری الفاظ یہ نہیں تھے: "ان بچّوں کی نگرانی کرنا؟"

نرن نے اس آشرم کی دیکھ بھال پُورے عزم سے شروع کر دی اور اس بات کی اجازت نہیں دی کہ ساتھی صرف خدا کی یاد کی مجہولیت میں پڑے رہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اس کے ممبروں کو بیدار رکھا، بڑی بے رحمی سے اُن کے ذہنوں کو مہمیز کرتے رہے، اُن کو اعلیٰ ترین خیالات رکھنے والی کتابیں پڑھ کر سُناتے رہے۔ انھوں نے آفاقی ذہن کے ارتقا کا مسئلہ انھیں سمجھایا، بڑے بڑے فلسفیانہ اور مذہبی مسائل پر خشک اور پُرزور مباحثوں میں اُلجھنے پر مجبور کیا، انھوں نے بڑی سرگرمی سے لامحدود سچائی کے اُس افق تک اُن کی رہنمائی کی جو تمام مکاتبِ خیال اور نسلوں سے آگے ہے اور جہاں خاص حقائق مِل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اس رُوحانی امتزاج نے رام کرشن کے پیغامِ محبّت کے دعوے کی تکمیل کر دی۔ گرُو، جو نظروں سے اوجھل تھے اب بھی اُن مجلسوں کی صدارت کر رہے تھے۔ وہ اس قابل ہو گئے کہ اپنی ذہنی مشقت کے نتائج گرُو کے ہمہ گیر دل کی خدمت کے لئے پیش کر سکیں۔

اگرچہ یورپ کو ایشیائی بے عملی میں یقین ہے لیکن یہ مذہبی ہندوستان کی فطرت میں نہیں ہے کہ وہ فرانسیسی اُمرا کی طرح ایک جگہ بند پڑا رہے۔ یہاں تک کہ وہ بھی جو مراقبہ میں رہنے کے عادی ہیں، اپنے خون میں یہ مادی جذبہ رکھتے ہیں کہ کسی جگہ کو اپنا مستقل مسکن بنائے بغیر مستقل توقعات قائم کئے بغیر آزادی اور اجنبیوں کی طرح ساری دنیا میں پھریں۔ گھومنے پھرنے والے بیراگی بن جانے

کے رجحان نے بارنا گور کے چند بیراگیوں کو اس پر آمادہ کر دیا جسے ہندو مذہبی زندگی میں "پری ودراجک" کے مخصوص نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب سے یہ سنگٹھن قائم ہوا تھا سب کبھی مکمل طور سے یکجا نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے دو خاص شاگرد، یوگانند اور لاٹو ۱۸۸۶ء کی کرسمس رات کے روحانی اجتماع میں شریک نہ تھے۔ کچھ رام کرشن (پرم ہنس) کی بیوہ کے ساتھ بندرابن چلے گئے تھے، کچھ نوجوان شرر کی طرح اچانک یہ بتائے بغیر غائب ہو گئے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اس خواہش کے باوجود کہ باندھنے والی گرہیں مضبوط رہیں، نرین کو بھی اسی طرح نکل کھڑے ہونے کا جذبہ ستا رہا تھا۔ روح کی یہ سیلانی ضرورت اس نامہ بر کبوتر کی طرح جو اپنے کبوتر خانے کی چھت کے نیچے گھٹن محسوس کرتا ہے اور فضا کے سمندر میں اڑنے کی یہ خواہش، ایک نوزائیدہ جماعت کے ضرورتِ قیام کی پابندیوں سے کس طرح ہم آہنگ ہو سکتی تھی! یہ طے ہوا کہ اس گروہ کے کچھ نہ کچھ لوگ ہمیشہ بارنا گور میں رہیں اور دوسرے ساتھی "جنگل کی پکار" پر لبیک کہیں۔ ان میں سے ایک نے جس کا نام ششی تھا، آشرم کو کبھی نہ چھوڑا، وہ آشرم کا وفادار محافظ بنا رہا، جو غیر متحرک مرکز اور کبوتر خانہ کی منڈیر تھا، جہاں یہ آوارہ طائر ہر پھر کر آیا کرتے تھے۔

نرین نے اس طرح پرواز کر جانے کی خواہش کو دو برس تک دبائے رکھا۔ چھوٹے چھوٹے سفر کے علاوہ وہ ۱۸۸۸ء تک بارنا گور ہی میں رہے۔ پھر وہ اچانک چلے گئے، تنہا نہیں بلکہ ایک ساتھی کے ہمراہ۔ اگرچہ ان کی نکل جانے کی خواہش بہت شدید تھی لیکن ڈھائی برس تک ان کے ساتھی جب بھی بلاتے یا کوئی انہونی بات واقع ہو جاتی تو وہ واپس آتے۔ اس کے بعد ان پر نکل کھڑے ہونے کی مقدس دیوانگی طاری ہوئی۔ جس خواہش کو پانچ سال سے انھوں نے اپنے اندر دبا رکھا تھا اس نے سارے بند توڑ دیئے۔ ۱۸۹۱ء میں بغیر کسی ساتھی کے، تنہا، کسی نام کے بغیر، لاٹھی یا کاسہ ہاتھ میں لئے بغیر، ایک گمنام بھکاری کی

طرح نکلے اور انھیں ہندوستان کی وسعت نے برسوں کے لئے اپنی وسعت میں سمولیا۔

لیکن ان کے اس غیر مقررہ سفر کی ہدایت ایک اندرونی منطق کر رہی تھی، "اگر تونے مجھے پا نہ لیا ہوتا تو مجھے تلاش ہی نہ کرتا"۔ یہ زندہ جاوید الفاظ ان لوگوں سے زیادہ کسی کے لئے صحیح نہیں ہیں جن کی رُوحوں پر پوشیدہ خدا کا قابو ہوتا ہے، جو اس سے برسر پیکار رہتے ہیں تاکہ وہ جس کام کے لئے مقرر کئے گئے ہیں اُس کے راز اُس (خدا) سے معلوم کرلیں۔

نرن کو اس بات میں ذرا بھی شک نہ تھا کہ ایک اہم مقصد اُن کے انتظار میں ہے، اُن کے اندر سے اُن کی قوتیں اور اعلیٰ صلاحیتیں یہی آواز دیتی تھیں۔ زمانے کی بیمار حالت، وقت کے مصائب اور ستائے ہوئے ہندوستان کی چاروں جانب سے سُنائی دیتی ہوئی خاموش پکار، اس کے قدیم دبدبہ کی مقدّس شان اور اپنے ہی فرزندوں کی غدّاری سے پیدا ہونے والی قومی ذلّت اور ناکامی تقدیر کے درمیان تقابل، موت اور پھر سے جی اُٹھنے کی کشمکش، مایوسی اور محبّت کی کشمکش، یہ ساری باتیں اُن کے دل کو مسوس رہی تھیں لیکن اُن کا مِشن کیا ہوگا؟ انھیں کون اس پر عمل کرنے کا حکم دے گا؟ یہ باتیں ان پر واضح کئے بغیر مقدس ہادی کا انتقال ہوگیا تھا اور کیا زندوں میں کوئی ایسا تھا جو اُن کی راہ روشن کرسکتا؟ (نہیں، کوئی نہیں!) صرف خدا تھا۔ پھر وہی کچھ بتاتے! وہ خاموش کیوں ہے؟ اس نے جواب دینے سے کیوں انکار کیا؟

نرن اس کی تلاش میں نکلے۔

انھوں نے اچانک ۱۸۸۸ء میں کلکتہ چھوڑا اور وارانسی، اجودھیا، لکھنؤ، آگرہ ہاتھرس اور ہمالیہ کے پہاڑوں میں گئے۔ اس یاترا اور اس کے بعد کی یاتراؤں کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہے کیونکہ نرن نے اپنے مذہبی تجربات کو راز میں رکھا۔ تھوڑا بہت صرف اُن کے

ان ساتھیوں سے معلوم ہوا جو یا تو اُن کے ساتھ تھے یا انھیں راستہ میں ملے ۱۸۸۸ء میں جب وہ اپنے پہلے سفر میں تھے اور بندرابن سے چل کر ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن ہاتھرس پہنچے تھے، وہیں بغیر کسی خاص ارادے کے انھوں نے پہلا شاگرد بنایا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو ابھی ایک لمحہ پہلے تک بالکل اجنبی تھا اور دوسرے لمحے میں ان کی نگاہوں کی کشش سے کھنچ کر اپنا سب کچھ تج کر ان کے ساتھ ہو لیا اور مرتے دم تک وفادار رہا۔ اس کا نام شرت چندر گپت تھا (اس نے اپنا نام سدانند رکھ لیا) دونوں فقیروں کے بھیس میں اِدھر اُدھر جاتے تھے، اکثر دھتکارے جاتے تھے، بھوک اور پیاس سے مرنے کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ انھیں ذات پات کا خیال نہ تھا اور وہ ایک بالکل نیچی ذات کے ہاتھ سے حقّہ پی لینے پر بھی تیار تھے۔ اس میں سدانند بیمار ہو گئے اور نرن انھیں خوفناک جنگلوں میں اپنے کندھوں پہ لئے پھرے، پھر وہ خود بیمار ہو گئے اور انھیں کلکتہ واپس آنا پڑا۔

اس پہلے ہی سفر نے قدیم ہندوستان کی تصویر اُن کی آنکھوں کے سامنے کر دی، امر ہندوستان، دیوتوں کا بھارت، جس میں بہادروں اور دیوتاؤں کی نسلیں تھیں، تاریخ اور قصّوں کا لباس پہنے ہوئے! اس میں آریہ مغل اور دراوڑ سب ایک ہو گئے تھے۔ اس پہلے رابطہ میں انھوں نے ہندوستان اور ایشیا کے روحانی اتحاد کو دیکھ لیا اور اپنی اس دریافت کو اپنے بارنا گورہ کے ساتھیوں تک پہونچایا۔

۱۸۸۹ء میں جب وہ دوسری یاترا پر غازی پور گئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سے وہ اس صحیفۂ انسانیت کا وجدان لائے جو مغربی جمہوریتیں غیر شعوری اور انجانے طور پر لکھ رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے ساتھی بھائیوں کو بتایا کہ کس طرح نیابت الٰہی کا وہ عقیدہ جو پہلے صرف ایک ذات سے وابستہ تھا، مغرب میں آہستہ آہستہ طبقاتی امتیاز کے بغیر سب کی ملک قرار دے دیا

گیا ہے اور اس طرح انسانی رُوح نے فطرت کی الوہیت اور وحدت کا تصوّر پیدا کر لیا ہے۔ انھیں بہت جلد اس ضرورت کا احساس ہو گیا اور انھوں نے اس کا اعلان بھی کر دیا کہ جس قسم کے خیالات امریکہ اور یورپ میں ایسے خوشگوار نتائج پیدا کر رہے ہیں انھیں ہندوستان میں رائج ہونا چاہیے۔ اس طرح انھوں نے ابتدا ہی میں رُوح کی آزادی اور عظمت کا اظہار کیا جو مشترک مفاد چاہتی ہے اور کوشاں ہے کہ تمام انسانوں کی مشترکہ کوششوں سے تمام انسانوں کا بھلا ہو۔

۱۸۸۹ء اور ۱۸۹۰ء میں انھوں نے الہ آباد اور غازی پور کے جو مختصر سفر کئے اُن سے اُن کے اس آفاقی تصوّر کو اور زیادہ تقویت پہنچی۔ غازی پور میں اُن سے جو سوالات پوچھے گئے اُن کے جواب میں وہ جن باتوں کے درمیان امتزاج کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ امتزاج ہے ہندو مذہب اور جدید سائنس کے درمیان، دیہاتی خیالات اور عہدِ جدید کے قابلِ عمل سماجی تصوّرات کے درمیان، خالص روح اور ان چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کے درمیان جو ہر مذہب میں "پست تر خیالات" کی شکل میں پائے جاتے ہیں کیونکہ یہ اپنی اس صفت میں کہ علم کے سائے ہیں سچ ہیں، انسانی رُوح کے ارتقاء میں ان مختلف طریقوں اور منزلوں کے درمیان جن سے وہ آہستہ آہستہ اپنے وجود کی بلندی پر پہنچنے کے لئے گذر رہی ہے۔

یہ اُن کے مستقبل کی صرف جھلکیاں اور بھدّے نقش تھے لیکن یہ سب اُن کے دماغ میں جمع ہو کر ہیجان پیدا کر رہے تھے۔ اس نوجوان میں بارنا گور آشرم کی تنگ چوحدّی کے اندر ایک زبردست طاقت کا نشو و نما ہو رہا تھا جس کا اظہار روزمرّہ کے مقررہ فرائض اور دوستوں سے میل جول میں بھی ہوتا تھا۔ اب یہ اس کے اندر سما نہیں سکتی تھی! وہ ان بندشوں کو توڑ ڈالنے اور اُن زنجیروں کو اُتارنے پر مجبور ہوئے جو اُنھیں جکڑے ہوئے تھیں۔ زندگی، نام اور جسم، ہر وہ چیز جو اُن سے عبارت تھی، سب کو بدل کر دوسروں کی مدد سے ایک

نئی ذات بنانا تھا جس میں وہ دیو آزادی سے سانس لے سکے جو دیو ڈھیلی آگیا تھا، گویا اُسے دوبارہ پیدا ہونا تھا۔ یہ نیا جنم دویکانند کا تھا۔ وہ ایک دیو کی طرح تھے جو دم گھٹانے والی پٹیوں کو توڑ رہا تھا...... اسے اب صرف اس زائر کو بلانے والی مذہبی دعوت نہیں کہہ سکتے جو خدا کی طرف جانے کے لئے اپنے ساتھیوں سے رخصت ہوتا ہے! اپنی غیر مستقل قوّتوں کے دبانے کی وجہ سے یہ جوان کھلاڑی موت کے دروازے پر پہونچ گیا تھا، اب وہ ایک حیاتیاتی جذبے سے مجبور ہو گیا جس کا اظہار اُس کی اُس زوردار تقریر میں ہوا جس پر اس کے پاکباز شاگردوں نے نقاب ڈال رکھی ہے۔ وارانسی میں انھوں نے کہا: "میں جا رہا ہوں لیکن ہرگز واپس نہیں آؤں گا جب تک کہ میں سماج پر ایک بم کے گولے کی طرح پھٹ نہ پڑوں اور اسے مجبور نہ کردوں کہ وہ کتّے کی طرح میرے پیچھے پیچھے چلے۔"

ہم کو معلوم ہے کہ انھوں نے کس طرح خود ہی ان خوفناک بھوتوں کو پسپا کیا اور بڑی خاکساری کے ساتھ غریبوں کی خدمت میں لگا دیا لیکن اسی کے ساتھ ہم اس پر بھی خوش ہوتے ہیں کہ تکبر اور حوصلہ مندی کی جو وحشیانہ طاقتیں اُن کا گلا گھونٹ رہی تھیں اُن پر فتح حاصل ہو گئی، کیونکہ وہ اپنی ان قوّتوں کی فراوانی سے تکلیف میں مبتلا تھے جو اقتدار حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اُن کے اندر ایک نیپولین تھا۔

چنانچہ شروع جولائی ۱۸۹۰ئہ میں وہ اپنے اس محبوب بارانا گور سے کئی سال کے لئے نکل پڑے جس کی بنیاد انھوں نے اُس نشیمن پر رکھی تھی جس میں رام کرشن بیٹھا کرتے تھے۔ اُن کے پرانے دورے اُٹھے۔ اپنے اس طویل سفر کے لئے پہلے وہ "مقدس ماتا" (رام کرشن کی بیوہ) کے پاس برکت حاصل کرنے کے لئے گئے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ تمام چیزوں سے آزاد ہو کر ہمالیہ کے پہاڑوں میں گوشہ گیر ہو جائیں۔ لیکن، تمام اچھی چیزوں میں خلوت گزینی رخنہ!

لیکن سماجی رُوح کے لئے خطرہ!) اختیار کرنا سب سے مشکل کام ہے۔ والدین، دوست سب اس کی مخالفت کریں گے۔ (ٹالسٹائے اُسے جانتا تھا اور آیسٹاپوؤو کے بستر مرگ سے پہلے اُسے کبھی حاصل نہ کرسکا......) جو لوگ اس سے بھاگنا چاہتے ہیں، سماجی زندگی انھیں سیکڑوں طرح سے گھیرتی ہے اور اس وقت اور زیادہ جب کہ بھاگنے والا ایک تازہ گرفتار ہو! نرنؔ کو بڑی مصیبتیں جھیل کر اس کا علم ہوا، اور ان کے لئے اذیت ناک ہوا جو اُن سے محبّت کرتے تھے۔ اُن کے ساتھی بیراگی ان کے ساتھ چلنے پر مُصر تھے۔ کسی قدر بیدردی سے انھوں نے اپنا ساتھ چھوڑنے پر انھیں مجبور کیا۔ المناک دنیا انھیں اس کی اجازت بھی نہیں دیتی تھی کہ وہ اُسے بھلا دیں۔ بہن کی موت نے انھیں اُن کے گوشۂ عزلت میں بھی پا لیا، وہ ظالم سماج کا ایک رحم انگیز شکار تھیں، وہ انھیں ہندو عورت کی پُر ایثار قسمت اور اپنے ملک کی زندگی کے مسائل یاد دلاتی تھیں۔ یہ باتیں ایک غیر متعلق تماشائی بنے رہنے میں مجرم بناتی تھیں۔ ٹھیک اسی وقت جب وہ یہ سوچ رہے تھے کہ آخر کار انھیں تنہائی نصیب ہو گئی، حالات کے سلسلہ نے، جنھیں پہلے سے مقدّر کہا جا سکتا ہے، انھیں مسلسل اس سے دُور رکھا جسے "با برکت تنہائی ہی برکت ہے" کہہ سکتے ہیں، اور انھیں پُر سکون ہمالیہ سے اُٹھا کر ان میدانوں میں پھینک دیا جہاں انسانوں کی پیدا کی ہوئی گرد اور آوازیں تھیں۔ ان ذہنی اُلجھنوں کے نتیجے میں، جن میں کشمکش اور تکالیف بھی شامل تھیں، وہ دو بار سخت بیمار ہو گئے۔ ایک بار رُودر پریاگ میں اور دوسری دفعہ کوہ ہمالیہ کے دامن میں دریائے گنگا کے قریب رشی کیش میں۔ ڈبل نمونیا نے قریب قریب اُنھیں مار ہی ڈالا تھا۔ بیماری کے بعد کی بے حساب کمزوری نے اس کو اور مشکل بنا دیا کہ وہ تنہا سفر کریں۔

پھر بھی یہ سفر انجام پایا۔ اگر انھیں مرنا ہی تھا تو وہ اس راستے پر مرنا چاہتے تھے جو خود اُن کا راستہ تھا، جو راستہ خدا نے انھیں دکھایا تھا! دوستوں کے اصرار کے باوجود فروری ۱۸۹۱ء میں وہ دہلی سے تنہا نکل پڑے۔ یہ بڑا اسفر تھا۔ ایک غوطہ خور کی طرح وہ ہندستان کے عظیم سمندر میں کود پڑے اور اس عظیم سمندر نے اُن کے راستے کو ڈھک لیا۔ اس سمندر کی سطح پر تیرتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے اور جہاز سے پھینکے ہوئے سامانوں میں اُن کی حیثیت ایک گمنام سنیاسی کی تھی جو گیروے لباس میں ہزاروں دوسرے سنّیاسیوں میں سے ایک تھا۔ لیکن غیر معمولی ذہانت کی آگ اُن کی نگاہوں میں روشن تھی۔ بدلے ہوئے بھیس کے باوجود وہ ایک شہزادے کی طرح تھے۔

———:(۴):———

زائرِ ہندوستان

دو سال ہندوستان میں اور پھر تین سال تک دُنیا کے گرد (کیا یہ اُن کے ابتدائی مقصد میں شامل تھا؟) یہ زبردست چکر، اُن کی فطرت کے دُوہرے تقاضوں، آزادی اور خدمت کا مناسب جواب تھا۔ وہ منصوبہ، قوم اور گھر سے آزاد تنہا خدا کے ساتھ مستقل پھرتے رہے۔ اُن کی زندگی کا کوئی گھنٹہ ایسا نہ تھا جب شہر اور دیہات میں، امیر اور غریب، ہر طرح کے زندہ انسانوں کے غم خواہشات، بداعمالی، پریشان حالی اور تکالیف سے ان کو دوچار نہ ہونا پڑتا ہو۔ وہ اُن کی زندگیوں کے ساتھ ایک ہو گئے۔ "کتابِ زندگی" نے اُن پر ہر وہ بات واضح کر دی جو کتب خانوں کی تمام کتابیں نہیں کر سکتی تھیں (کیونکہ بہرحال وہ انھیں کے مجموعے ہیں) جیسے رام کرشن کے شدید جذبۂ محبت نے بھی جیسے خواب میں دھندلی شکل میں دیکھا تھا۔ یہ موجودہ عہد کا المناک چہرہ تھا، خدا تھا جو انسانیت کے اندر کشمکش میں مبتلا تھا اور مدد کے لئے ہندوستان اور دنیا کے لوگوں کی پکار تھی اور اس نئے اوڈی پس کا دلیرانہ فرض تھا کہ تھیبیس کے شہر کو اسفنکس (تھیبیس کی پردار دیوئی) کے پنجہ سے بچائے یا تھیبیس کے ساتھ خود بھی ہلاک ہو جائے۔

"سفر کے سال اُمیدواری کے سال ہیں!" کیسی عجیب تعلیم! .... وہ صرف ایک معمولی سادھو نہیں رہ گئے تھے جو گھوڑوں کے اصطبل میں یا بھکاریوں کے بوریئے پر رات کو پڑھتا ہو بلکہ وہ ہر شخص سے برابری کے درجے پر تھے۔ آج وہ ایک دھتکارے ہوئے بھکاری ہیں جیسے کسی اچھوت نے پناہ دی ہے اور کل راجاؤں کے مہمان، کبھی وزرائے اعلیٰ اور مہاراجاؤں سے برابر کی سطح پر بات کرتے ہوئے کبھی کسی مظلوم کے بھائی کی طرح اس کے غم میں شریک، کبھی اُمراء کے عیش و آرام کا جائزہ لیتے ہوئے اور اُن کے مُردہ دلوں میں عوام کی بہبودی کے جذبات جگاتے ہوئے۔ وہ پنڈتوں کے علوم سے بھی اسی طرح واقف تھے جیسے صنعتی اور دیہی معیشت کے مسائل سے، جن سے لوگوں کی زندگی کا نظام چلتا ہے۔ وہ ہمہ وقت تعلیم دیتے رہے، ہمہ وقت سیکھتے رہے اور اس طرح آہستہ آہستہ ہندوستان کا ضمیر، اس کی وحدت اور اس کی تقدیر بن گئے۔ وہ ان تمام چیزوں کے اوتار تھے اور دُنیا نے ان کا نظارہ وِویکانند میں کیا۔

اپنے سفر میں وہ اِن مقامات سے گذرے: راجپوتانہ، الور (فروری تا مارچ ۱۸۹۱ء) جے پور، اجمیر، کھیتری، احمد آباد اور کاٹھیاواڑ (ستمبر کے خاتمہ پر) جونا گڑھ اور گجرات، پوربندر (جہاں آٹھ نو مہینے قیام کیا) دوارکا، پالیتانا جو خلیج کمبایت کے قریب مندروں کا شہر ہے، بڑودہ، کھنڈوا، بمبئی، پونا، بلگام (اکتوبر ۱۸۹۲ء) بنگلور، ریاست میسور، کوچین، ملابار، ریاست ٹراونکور، ٹریونڈرم اور مدورا ...... وہ اس عظیم الشان اہرام (ہندوستان) کے آخری نقطہ رامیشورم تک گئے جو جنوبی ہند کا وارانسی اور راما تن کا روم ہے، پھر اس سے بھی آگے کنیا کماری گئے جو عظیم المرتبت دیوی کی عبادت گاہ ہے۔ (دسمبر ۱۸۹۲ء کا خاتمہ)

شمال سے جنوب تک ہندوستان کا قدیم ملک، دیوی دیوتاؤں سے بھرا ہوا تھا لیکن ان کے لاتعداد ہاتھوں کی ناشکستہ زنجیر سے صرف ایک خدا بنتا تھا۔ انھوں نے ان کے گوشت پوست اور رُوح کی وحدت محسوس کی، انھوں نے ان کو ہر ذات اور بے ذات والوں کے ساتھ بسر کر کے بھی محسوس کیا اور ان کو بھی اسی طرح محسوس کرنا سکھایا۔ وہ افہام و تفہیم کو ایک سے دوسرے کے پاس لے گئے جو روحانیت میں بلند تھے، جو مطلق کے چکّر میں پھنسے ہوئے دانشور تھے، اُن کو انھوں نے مورتیوں اور بتوں کی عزّت کرنے کی تعلیم دی، نوجوانوں کو اعلیٰ پایہ کی قدیم کتابوں، ویداور پُران، تاریخی نظموں اور سب سے بڑھ کر اپنے عہد کے انسانوں کے مطالعہ کی تلقین کی اور ہر ایک کو مادرِ ہند سے مذہبی انداز کی محبّت اور اس کی نجات کے لئے خود کو وقف کر دینے کے لئے اُکسایا۔

جو کچھ انھوں نے دیا اُس سے کم انھیں ہاتھ بھی نہیں آیا۔ اُن کی زبردست رُوح نے اپنے علم میں اضافہ کرنے اور اپنے تجربے بڑھانے میں ایک دن بھی کمی نہیں کی۔ انھوں نے ہر خیال کے دریاؤں کو جو بکھرے ہوئے یا زمین کے نیچے دفن تھے، اپنے اندر جمع کر لیا کیونکہ اُن کے مخرج انھیں ایک ہی معلوم ہوتے تھے۔ وہ کٹّر مذہب پرستوں کی اندھی عقیدت سے، جو ٹھہرے ہوئے پانی کے گندے کیچڑ میں لتھڑی ہوئی تھی، اُتنا ہی دُور تھے جتنا برہمو سماج مصلحوں کی گمراہ عقلیت پرستی سے، جو بہترین نیّت کے باوجود اندرونی طاقت کے چھُپے ہوئے عارفانہ چشموں کو خشک کر رہے تھے۔ وہ یکتائے مذہبی رُوح رکھنے والے پورے برِاعظم کے سارے گندے آبی ذخیرے کو صاف کر کے محفوظ رکھنا اور متحد کرنا چاہتے تھے۔

ان کی تمام خواہش تو اس سے بھی زیادہ تھی (کوئی بھی بے خوف ہو کہ اُن بڑے انجنیروں کا ہمعصر نہیں بن سکتا جو بحر اعظموں کے درمیان راستہ بنا کر کسی نہ کسی طرح بر اعظموں کو ملا دیتے ہیں!) وہ جہاں کہیں بھی جاتے تھے دِی اِمی ٹیشن آف کرائسٹ اپنے ساتھ لے جاتے اور بھاگوت گیتا کے ساتھ ساتھ وہ مسیح کے خیالات بھی پھیلاتے تھے۔ وہ نوجوانوں پر زور دیتے تھے کہ وہ مغرب کی سائنس کا مطالعہ کریں۔

لیکن اُن کا ذہن صرف خیالات اور افکار کی دنیا میں وسیع نہیں ہو رہا تھا۔ دوسروں کے ساتھ اخلاقی تعلقات کے سلسلہ میں بھی اُن کے اندر ایک انقلاب آیا۔ اگر کبھی کسی نوجوان میں ایسا تکبر تھا جس میں ذہنی عدم رواداری کا میل بھی ہو، اور ہر اُس چیز کے لئے جو اس کی لطافت کے نقطۂ سے نیچے ہو، ایک شاہانہ انداز کی نفرت بھی ہو، تو وہ بات نریندر میں موجود تھی۔

"بیس سال کی عمر میں (اور یہ انھیں کے الفاظ ہیں) میں بے حد غیر ہمدرد غیر رواداری کٹر شخص تھا، میں کلکتہ کی سڑکوں پر اُس فٹ پاتھ پر بھی نہیں چلتا تھا جدھر تھیئٹر تھا۔"

سفر کے ابتدائی مہینوں میں جب وہ جے پور کے قریب مہاراجہ کھیتری کے ساتھ تھے (اپریل ۱۸۹۱ء) ایک کم عمر رقاصہ نے بڑی سادہ لوحی سے انھیں فروتنی کا ایک سبق دیا۔ جب وہ آئی تو پُر حقارت سادھو (دویکانند) جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مہاراجہ نے اُن سے رُکنے کی درخواست کی اور رقاصہ نے (سور داس کا یہ بھجن گایا):

"اے پربھو میری بُرائیوں کو نہ دیکھ! تیرا نام سب کو ایک نظر سے دیکھنے والا ہے، ہم دونوں کو برہمن بنا دے! لوہے کا ایک ٹکڑا مندر کی مورتی میں لگا ہے اور اسی کا دوسرا ٹکڑا چھرا بن کر قصائی کے ہاتھ میں ہے لیکن جب

وہ پارس پتھر سے چھو جاتے ہیں تو دونوں سونے میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔
اِس لئے اَے پربھو! میری برائیوں کو نہ دیکھ! تیرا نام سب کو ایک نگاہ
سے دیکھنے والا ہے! ....
"پانی کا ایک قطرہ مقدس جمنا میں ہے اور دوسرا قطرہ سڑک کے کنارے
گندی نالی میں لیکن جب یہ دونوں گنگا میں ملتے ہیں تو پاک ہو جاتے ہیں۔
اس لئے اے پربھو! میری برائیوں کو نہ دیکھ! تیرا نام سب کو ایک نگاہ سے
دیکھنے والا ہے! ......"

نرین بالکل بے قابو ہو گئے۔ اس معمولی گیت میں جو ایمان ظاہر کیا گیا تھا اس نے انھیں زندگی بھر متاثر رکھا۔ بڑی مدت گزر جانے کے بعد بھی انھوں نے اس کا تذکرہ پُرجوش انداز میں کیا۔

ایک ایک کرکے اُن کے تعصبات مِٹ گئے، وہ تعصبات بھی جن کے متعلق اُن کا کہنا تھا کہ اُن کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ ہمالیہ میں وہ بعض تبتی قبیلوں کے ساتھ رہتے تھے جن میں "چند شوہری" (ایک بیوی کئی شوہر) رائج تھی۔ وہ ایک ایسے خاندان کے مہمان تھے جہاں چھ بھائیوں کے بیچ ایک بیوی تھی۔ اپنے نئے مذہبی جوش میں انھوں نے اُن کو اُن کی بدکاری سے آگاہ کرنے کی کوشش کی لیکن اُن کے جواب نے انھیں پر تہمت لگا دی، انھوں نے کہا: "یہ کیسی خودغرضی ہو گی! ایک عورت کو ایک ہی شخص تنہا اپنے لئے رکھے!" سچ پہاڑ کے نیچے اور غلطی چوٹی پر ......! انھوں نے نیکیوں کی اضافیت کو جان لیا، کم سے کم اُن نیکیوں کو جن کے پیچھے زبردست روایتی جواز تھا۔ اس کے علاوہ ایک ماورائی طنز نے، جیسا کہ پاسکل کے ساتھ ہوا تھا، اخلاقی تصورات کے متعلق

انھیں وسعتِ نگاہ کا درس دیا۔ خاص کر اُس وقت جب وہ ایک قوم یا ایک عہد کی اچھائی بُرائی کے متعلق فیصلہ کرنے لگتے تھے تو اس قوم اور عہد کے معیاروں سے مطابقت پر ضرور نظر رکھتے تھے۔

ایک دفعہ انھیں چوروں کے ساتھ رہنا پڑا جو بڑی نیچی ذات کے تھے اور انھیں تسلیم کرنا پڑا کہ لوٹ مار کرنے والوں میں بھی ایسے "گناہ گار ہوتے ہیں جن کے اندر ولی پیدا ہوتا ہے" انھوں نے ہر جگہ مظلوم طبقوں کی تکالیف اور ذلتوں میں حصہ بٹایا۔ وسطی ہندوستان میں وہ ایک اچھوت بھنگی کے ساتھ رہے "ان نیچے گرے ہوئے لوگوں میں، جو سماج کے قدموں میں لوٹتے ہیں، انھیں روحانی خزانہ ملتا تھا، اگرچہ اُن کی غریبی دیکھ کر دم گھٹنے لگتا تھا وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جب انھوں نے اخباروں میں یہ پڑھا کہ کلکتہ میں ایک شخص بھوک سے ہلاک ہو گیا تو وہ روتے ہوئے سسکیاں لے لے کر کہتے تھے: "ہائے میرے ملک! ہائے میرے ملک!......" وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے اور کہتے تھے: "ہم نے کیا کیا ہے؟ ہم جو خدا رسیدہ کہے جاتے ہیں، ہم سنیاسی، ہم نے عوام کے لئے کیا کیا ہے؟"

انھیں رام کرشن کے نا ملائم الفاظ یاد آئے: "مذہب خالی پیٹ کے لئے نہیں ہے" اور خود غرضانہ عقیدہ کے ذہنی قیاسات سے بے صبر ہو کر انھوں نے مذہب کا سب سے پہلا فرض یہ قرار دیا کہ وہ "غربا کی دیکھ بھال کرے اور انھیں اوپر اٹھائے" یہ فرض انھوں نے امرائے سرکاری عمال اور راجاؤں پر عائد کیا: "کیا تم میں کوئی ایسا نہیں ہے، جو دوسروں کی خدمت کے لئے اپنی جان دے؟ دینیات کا مطالعہ اور مراقبہ کے عمل کو مستقبل کے لئے چھوڑ دینا چاہئے! اس جسم کو دوسروں کی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہئے، اسی وقت میں یہ سمجھوں گا کہ تم میرے پاس فضول نہیں آتے ہو۔"

بن میں ایک دن اُن کے درد انگیز الفاظ اس اعلیٰ قول میں ظاہر ہوئے: "کاش میں بار بار جنم لوں، اور ہزاروں مصائب میں مُبتلا ہوں اگر میں صرف اس تنہا خدا کی پرستش کرسکوں جس پر میرا ایمان ہے، تمام رُوحوں کا مجموعہ، اور اس سے بھی بڑھ کر میرا وہ خدا جو ظالم ہے، جو ستم رسیدہ ہے، ساری قوموں کا غریب میرا خدا......"

۱۸۹۳ء میں ان دنوں ان کے پیشِ نظر ہندوستان کی زبوں حالی تھی جو اُن کے دماغ پر تمام دوسرے خیالوں کو نکال کر مُسلّط تھی۔ یہ ہندوستان کے شمال سے جنوب تک اُن کا تعاقب اس طرح کر رہی تھی جیسے شیر اپنے شکار کا تعاقب کرتا ہے۔ بے خواب راتوں میں یہ انھیں گھلائے دیتی تھی۔ راس کماری میں اس نے انھیں اپنے جبڑوں میں لے لیا۔ اِس بار انھوں نے اپنا جسم اور رُوح دونوں کو تج دیا اور اپنی زندگی پریشاں حال عوام کے لئے وقف کردی۔

لیکن وہ اُن کی مدد کس طرح کرسکتے تھے! ان کے پاس دولت نہ تھی، وقت کی کمی تھی اور دو ایک راجہ مہاراجاؤں سے جو عطیہ مل سکتا تھا یا بعض بہی خواہ جماعتیں جو مدد کرسکتی تھیں وہ زبردست ضروریات کے ہزارویں حصّے ہی کے لئے کافی تھا۔ قبل اس کے کہ ہندوستان اپنی بے حسی سے جاگے اور عوامی مفاد کے لئے منظم ہو اس کی تباہی کا مکمل ہوجانا یقینی تھا۔ انھوں نے اپنی نگاہیں پھیلے ہوئے سمندر کی طرف اٹھائیں اور اس کے پار کی سرزمین کو دیکھا۔ انھیں ساری دُنیا سے اپیل کرنا چاہئے، ساری دنیا کو ہندوستان کی ضرورت ہے، ہندوستان کی صحت اور موت سے ان کا بھی تعلق ہے۔ کیا اس کے عظیم الشان روحانی ورثہ کو اس طرح تباہ ہونے دیا جائے جس طرح دوسرے مثلاً مصر اور کالڈیا کے تباہ ہوچکے تھے، جنھیں مدت مدید کے بعد لوگوں نے کھود کر نکالنے کی کوشش کی لیکن اُن میں ملبہ کے سوا کیا رہ گیا تھا؟ اُن کی رُوح تو ہمیشہ کے لئے ختم ہوچکی تھی ...... اس بے یار و مددگار مفکّر کے دماغ میں اس اپیل کا

ہیولیٰ بننا شروع ہو گیا جو ہندوستان، یورپ اور امریکہ سے کرنے والا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال پہلی مرتبہ ۱۸۹۱ء کے آخری دنوں میں جوناگڈھ اور پوربندر کے درمیان اُن کے ذہن میں پیدا ہوا۔ پوربندر میں، جہاں انھوں نے فرانسیسی زبان سیکھنا شروع کر دیا تھا، ایک پنڈت نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ مغرب میں جائیں، جہاں ان کے خیالات کی اپنے ملک سے زیادہ قدر ہوگی۔ اس نے کہا: "جاؤ، اچانک ان پر چھا جاؤ اور واپس آؤ!" ۱۸۹۲ء کے ابتدائی موسم خزاں میں انھوں نے پہلی دفعہ کھنڈوا میں اس مذہبی مجلس (پارلیمنٹ آف ریلیجنس) کا ذکر سنا جو اگلے سال شکاگو میں منعقد ہونے والی تھی۔ ان کے دل میں پہلا سوال جو پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ اس میں کس طرح شرکت کی جائے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ جب تک ہندوستان کی یاترا کے متعلق ان کا عہد پورا نہ ہو جائے وہ اس منصوبے کی طرف کوئی قدم نہ اٹھائیں بلکہ انھوں نے اس سلسلہ میں کسی قسم کا چندہ یا اعانت لینے سے انکار کر دیا۔ آخر اکتوبر میں، جب وہ بنگلور میں تھے انھوں نے واضح طور پر مہاراجہ سے "ہندوستان کی مادی حالت درست کرنے کے ذرائع کے لئے" مغرب کی طرف جانے اور اس کے بدلے میں وہاں ویدانت کا مقدس پیغام پہنچانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ سال کے خاتمہ تک اُن کا ارادہ پختہ ہو چکا تھا۔

اس وقت وہ "ہندوستان کے آخری کنارے" پر تھے، جنوب کے اس آخری نقطہ پر جہاں سے بندر دیوتا ہنومان نے اپنی مشہور جست لگائی تھی۔ لیکن وویکانند ہمیں لوگوں کی طرح ایک انسان تھے اور وہ دیوتاؤں کے راستے پر نہیں چل سکتے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کے وسیع ملک کی یاترا اپنے پیروں پر کی تھی۔ دو سال تک ان کا جسم ہندوستان کے عظیم الشان جسم سے متصل رہا تھا، انھوں نے بھوک پیاس کو ذلیل کرنے والے اور تازیانہ

فطرت رکھنے والے انسانوں کو برداشت کیا تھا۔ جب وہ راس کماری پہنچے تو تھک کر چور ہو چکے تھے لیکن ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ کشتی کا کرایہ دے کر اپنی منزل پر پہنچیں، وہ سمندر میں کود پڑے اور نہنگوں سے بھری ہوئی آبنائے کو پار کر گئے۔ آخر کاران کا سفر ختم ہو گیا اور پھر جیسے انھوں نے ایک پہاڑ کی بلندی سے نہ صرف اس پورے ہندوستان کو اپنی نگاہوں کے آغوش میں لے لیا جسے انھوں نے پار کیا تھا بلکہ اس دنیائے خیال کو بھی جس نے انھیں سارے سفر میں اُلجھائے رکھا تھا۔ دو سال تک وہ ایک اُبلتے ہوئے دیگ میں رہے تھے جس کی گرمی انھیں کھائے جاتی تھی، وہ ایک رُوح لئے پھر رہے تھے جو مستقل آتش زدہ تھی، ان کی حالت ایک طوفان اور آندھی کی تھی۔ پرانے زمانے کے مجرموں کی طرح جنھیں پانی میں کھڑے رہنے کی سزا دی جاتی تھی، انھیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو قوت ان کے اندر جمع ہو گئی ہے وہ انھیں غرق کئے دے رہی ہے، ان کے سیلاب کے سامنے ان کے وجود کی دیواریں ٹوٹ رہی ہیں...... اور جب وہ مینار کے برج پر پہنچ گئے تو گویا زمین کے اُس سرے پر چڑھ گئے جہاں سے دُنیا کی حسین وسعت نگاہوں کے سامنے پھیلی ہوئی نظر آتی تھی، انھیں ایسا معلوم ہوا کہ خون اُن کی کنپٹیوں کی طرف اس طرح چھلک کر بڑھ رہا ہے جیسے وہ سمندر جو اُن کے قدموں کے نیچے تھے۔ وہ قریب قریب بیہوش ہو گئے۔ اُن کے اندر متصادم دیوتاؤں کا یہ زبردست حملہ تھا۔ جب یہ کشمکش ختم ہوئی تو پہلی لڑائی جیتی جا چکی تھی، انھیں وہ راستہ نظر آ گیا تھا جس پر انھیں چلنا تھا اور وہ اپنے مشن کا انتخاب کر چکے تھے۔

وہ پھیر کر پھر ہندوستان واپس آئے۔ مقابل کے کنارے سے وہ شمال کی طرف چلے۔ رام ناد اور پانڈیچری ہوتے ہوئے وہ پیدل مدراس پہونچے اور وہاں ۱۸۹۳ء کے پہلے ہفتہ میں انھوں نے ایک جلسۂ عام میں اپنی اس خواہش کا اعلان کیا کہ وہ مغرب میں ایک

تبلیغی مشن لے جانا چاہتے ہیں۔ ان کی ذاتی خواہش کے برخلاف اُن کی شہرت اس سے قبل ہی باہر پہونچ چکی تھی، دانشوروں کے اس زندہ شہر میں، جہاں وہ دوبار قیام کر چکے تھے، لوگ انھیں گھیر لیتے تھے۔ یہیں مدراس میں انھوں نے اپنے اُن مخلص شاگردوں کا پہلا حلقہ بنایا جنھوں نے خود کو اُن کے لئے وقف کر دیا تھا، جو اُن سے کبھی جُدا نہیں ہوتے تھے۔ ان کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی وہ اپنے خطوں اور عقیدت مندیوں سے ان کو تقویت پہنچاتے رہتے تھے اور وہ بھی دور دراز ممالک سے ان کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔ ہندوستان کے لئے اُن کی پُرجوش محبت ان کے دلوں میں بازگشت پیدا کرتی تھی اور اُن کے جوش و خروش سے وویکانند کے مقاصد کو دس گنا تقویت پہونچتی تھی۔ وہ شخصی نجات کی کوشش کے خلاف تلقین کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ فکر کرنا چاہئے عوامی نجات کی، مادرِ وطن کے نئے جنم کی، ہندوستان کی رُوحانی طاقتوں کے احیاء کی اور ان کے ساری دنیا میں پھیلانے کی ... .

"حالات بہت سازگار ہیں، رشیوں کے عقائد کو متحرک بننا چاہئے، انھیں خول سے باہر نکلنا چاہئے"۔

اُمرا اور ساہوکاروں نے باہر کے سفر کے لئے انھیں روپے پیش کئے لیکن انھوں نے انکار کر دیا، بلکہ انھوں نے اپنے چندہ جمع کرنے والے شاگردوں سے کہا کہ وہ متوسط طبقہ کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ "میں یہاں کے مفلسوں اور عام لوگوں کی طرف سے جا رہا ہوں"۔

جیسا کہ انھوں نے اپنے سفر کی ابتدا میں کیا تھا، اس طویل سفر کے لئے بھی "مقدس ماتا" (رام کرشن کی بیوہ) کی آشیرباد چاہی۔ انھوں نے رام کرشن کی دعائیں بھی بھیجیں جو انھوں نے خواب میں اپنے محبوب شاگرد کے لئے دی تھیں۔

یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے اپنے بارناگور کے ساتھیوں کو بھی اس کے متعلق لکھا یا نہیں (بلا شبہ انھوں نے سوچا ہو گا کہ ان کی تفکر پسند روحیں جنھیں آشرم کی عادت پڑ گئی ہے، سماجی خدمت اور مختلف مذہب رکھنے والے ممالک میں مذہبی تبلیغ کے لئے جانے کے تصور سے گھبرائیں گی۔ اس قسم کے خیالات اُن لوگوں کے مقدس سکون میں خلل انداز ہوتے ہیں جو دوسروں کے لئے پریشان ہوئے بغیر صرف اپنی نجات کے خیال میں رہتے ہیں) لیکن ہونا یہ تھا کہ رخصت ہونے کے دن بمبئی کے قریب آبو روڈ کے اسٹیشن پر دو ساتھیوں برہمانند اور تریا آنند سے ملاقات ہو گئی اور ویویکانند نے اُن سے ایک دردانگیز جوش کے ساتھ زبوں حال ہندوستان کی پکار کا تذکرہ کیا جس نے انھیں باہر جانے پر مجبور کیا تھا، اس کے اثرات بارناگور بھی پہنچے:

"میں نے پورے ہندوستان کی یاترا کر لی ...... لیکن میرے رفیقو! یہاں کے غریب عوام کی پریشاں حالی اور مفلسی کا خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا میرے لئے تاب شکن تھا، میں اپنے آنسو نہ روک سکا! اب میرا یہ یقین واثق ہے کہ ان کی غریبی اور تکلیف کو دور کئے بغیر اُن سے مذہب کی بات کرنا بالکل عبث ہے، اس ارادے سے، ہندوستان کے غریبوں کی نجات کے ذرائع حاصل کرنے کے ارادے سے، میں امریکہ جا رہا ہوں۔"

وہ کھیتری گئے جہاں اُن کے دوست مہاراجہ نے اپنے دیوان کو اُن کے ساتھ کر دیا کہ وہ بمبئی تک اُن کے ساتھ جائے، جہاں سے وہ سوار ہونے والے تھے۔ روانگی کے وقت انھوں نے سُرخ ریشم کی عبا اور ہلکے بادامی رنگ کے صافے کے ساتھ ویویکانند کا نام بھی اختیار کر لیا، جسے وہ عنقریب دُنیا پر مسلّط کرنے والے تھے۔

——— ❊ ———

مغرب کا عظیم سفر

یہ سفر درحقیقت ایک حیرت انگیز مہم تھا۔ نوجوان سوامی آنکھ بند کیے بے سوچے سمجھے نکل پڑا۔ وویکانند نے مبہم طور پر بس اتنا سن رکھا تھا کہ امریکہ میں کسی جگہ کسی زمانے میں ایک مذہبی مجلس منعقد ہونے والی ہے۔ انھوں نے اس میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا حالانکہ نہ خود انھوں نے، نہ ان کے شاگردوں نے، نہ ہندوستان کے رفقاء، طالب علم، علماء، وزراء یا مہاراجہ نے اس کی زحمت اٹھائی تھی کہ اس کے متعلق کچھ معلوم کریں۔ انھیں کچھ بھی تو نہیں معلوم تھا، نہ اجتماع کی صحیح تاریخ، نہ داخلہ کے شرائط۔ وہ اپنے ساتھ کوئی تعارفی خط نہیں لے گئے۔ مکمل یقین کے ساتھ وہ سیدھے چلے گئے جیسے کہ ٹھیک وقت پہنچ جانا کافی تھا۔ اگرچہ مہاراجہ کھیتری نے ان کا جہاز کا ٹکٹ خرید دیا تھا اور شدید احتجاج کے باوجود ان کے لئے ایک خوبصورت عبا کا انتظام کر دیا تھا جو امریکہ کے بے فکروں کو ان کی شعلہ بیانی سے کچھ کم مسحور کرنے والی نہ تھی لیکن وہاں کے موسمی حالات یا طور طریقوں کا نہ خود انھوں نے خیال کیا تھا نہ کسی اور نے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ ہندوستان کے شاندار اور شائستہ لباس میں کناڈا پہونچے تو جہاز میں قریب قریب ٹھٹھر گئے۔

وہ بمبئی سے ۳۱ مئی ۱۸۹۳ء کو روانہ ہوئے اور سیلون، پنانگ، سنگاپور، ہانگ کانگ سے گزرے، اس کے بعد وہ کینٹن اور ناگاساکی گئے، وہاں سے اوساکا، کیوٹو اور ٹوکیو کو دیکھتے ہوئے خشکی کے راستے سے یوکوہاما پہونچے۔ چین اور جاپان دونوں ملکوں میں اُن کی توجہ اُن تمام باتوں کی طرف گئی جنھوں نے اُن کے مفروضے نہیں بلکہ عقیدے کی تصدیق کردی کہ مشرقِ بعید کی حکومتوں پر قدیم ہندوستان کے مذہبی اثرات ہیں اور ایشیا میں رُوحانی وحدت ہے جن برائیوں میں خود ان کا ملک گرفتار تھا، ان کے خیال نے کسی وقت اُن کا ساتھ نہیں چھوڑا اور جاپان کی ترقی نے تو زخموں کو پھر سے اُدھیڑ دیا۔

وہ یوکوہاما سے وینکوور گئے۔ وہاں سے وسطِ جولائی کے قریب ٹرین سے سفر کر کے انھوں نے خود کو ایک حیرت زدہ حالت میں شکاگو میں پایا۔ سارے راستہ میں ان کے بال بکھرے ہوئے تھے گویا کسی شکاری کے لئے بالکل نشانے پر تھے وہ دور ہی سے نظر آجاتے تھے شروع میں تو ایک قدرے زیادہ عمر کے بچّے کی طرح وہ شکاگو کی عالمی نمائش میں گھومتے ہر چیز کو منھ کھولے تعجّب سے دیکھتے رہے۔ ان کے لئے ہر چیز نئی تھی جو انھیں حیرت زدہ اور مدہوش کردیتی تھی۔ انھوں نے اس مغربی دنیا کی قوتِ ایجاد، دولت اور قوّت کا کبھی تصوّر بھی نہیں کیا تھا۔ مظہرِ قوّت کی کشش وہ ٹیگور اور گاندھی کے مقابلہ میں زیادہ جوش اور جذبہ سے محسوس کرتے تھے، وہ لوگ حرکت اور شور کے ہنگاموں اور پورے یورپ اور امریکہ (خاص کر امریکہ) کی مشینی زندگی سے بھی ہوجاتے تھے لیکن وویکانند کم سے کم شروع میں اس سے مطمئن رہے۔ اُن پر وہاں کی پُرجوش نشہ خیزی چھا گئی اور پہلا ردِعمل بچّوں کی طرح اُسے قبول کر لینے کا ہوا۔ ان کا جذبۂ تحسین کوئی حد نہیں رکھتا تھا۔ بارہ دن تک انھوں نے اس نئی دنیا کو اپنی پرشوق آنکھوں میں اچھی طرح بسایا۔ شکاگو پہنچنے کے چند دنوں بعد انھوں نے

سوچا کہ اس نمائش کے دفتر سے پوچھ گچھ کریں .... اور اس سے انھیں کتنی مایوسی ہوئی!
معلوم ہوا کہ مذہبی مجلس ستمبر کے پہلے ہفتہ کے بعد ہی ہوگی اور اب مندوب کی حیثیت سے
نام دینے کا وقت نہیں رہا، اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ بغیر کسی قسم کے سرکاری حوالہ کے
نام قبول بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ گمنام تھے، ان کے پاس کوئی تصدیق نامہ نہ تھا، وہ
کسی تسلیم شدہ جماعت کا اجازت نامہ نہیں رکھتے تھے اور اب اُن کی جیب بھی تقریباً خالی
ہو رہی تھی اور کانگریس کے شروع ہونے تک وہاں رکنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی ...... وہ
پریشان ہو گئے۔ انھوں نے اپنے مدراس کے دوستوں کو مدد کے لئے تار دیا اور ایک
مستند مذہبی جماعت سے گذارش کی کہ وہ اُن کی اعانت کرے لیکن ایسی باضابطہ
جماعتیں آزادی کو کبھی معاف نہیں کرتیں۔ جماعت کے رکن اعلیٰ نے جواب دیا کہ: "خود سر کو ٹھنڈک
سے ہلاک ہو جانے دو!"

نہ وہ مرے اور نہ ہمت ہاری۔ انھوں نے خود کو قسمت کے سپرد کر دیا اور بے عملی
کی حالت میں جو چند ڈالر بچ رہے تھے انھیں محفوظ رکھنے کے بجائے انھوں نے بوسٹن جا کر
وہ بھی خرچ کر دئے۔ قسمت نے اُن کی مدد کی، وہ ہمیشہ ان لوگوں کی مدد کرتی ہے جو خود اپنی
مدد کرنا جانتے ہیں۔ وویکانند کبھی کسی راستے سے اس طرح نہیں گذرتے تھے کہ کوئی اُن
کی طرف متوجہ نہ ہو، بلکہ وہ اس وقت بھی لوگوں کو مسحور کرتے تھے جب انھیں کوئی نہیں
جانتا تھا۔ بوسٹن جاتے ہوئے ٹرین میں ایک ہمسفر ان کی شکل وصورت اور بات چیت سے
متاثر ہوا، یہ میسی چوزٹس کی ایک دولتمند خاتون تھیں جنھوں نے اُن سے کچھ سوالات کئے
پھر اُن سے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ وہاں انھوں نے وویکانند
کا تعارف ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر جے۔ ایچ۔ رائٹ سے کرایا جو یونانی زبان کے ماہر تھے

وہ اس نوجوان ہندو کی ذکاوت سے بے حد متاثر ہوئے اور ہر طرح کی خدمت کے لئے آمادہ ہو گئے
انھوں نے اصرار کیا کہ وویکانند کو اس مذہبی مجلس میں ہندو مذہب کی نمائندگی کرنی چاہیے
اور اس کے لئے انھوں نے کمیٹی کے صدر کو خط بھی لکھ دیا۔ اس مفلس مسافر کے لئے انھوں
نے شکاگو تک کا ٹکٹ بھی خرید دیا اور کمیٹی کے نام ان کے ٹھہرائے جانے کے متعلق
ایک سفارشی خط بھی دے دیا۔ مختصر یہ کہ ان کی ساری دِقّتیں دُور ہو گئیں۔

وویکانند شکاگو واپس آئے، کمیٹی کا پتہ کھو گیا تھا اور بدحواسی کی حالت میں اُن
کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ وہ کہاں جائیں۔ کسی کو اس کی توفیق نہ ہوئی کہ اس کالے رنگ کے
انسان کی رہنمائی کرے۔ اسٹیشن کے ایک گوشے میں انھیں ایک بڑا سا خالی بکس نظر آیا۔
وہ اُس میں سو رہے۔ صبح کو وہ اپنا راستہ تلاش کرنے نکلے اور ایک سنیاسی کی طرح در در
پوچھتے پھرے۔ لیکن وہ ایک ایسے شہر میں تھے جو ہر فن مولا کی طرح روپیہ بنانے کے ہزار
طریقے جانتا ہے سوا اُس ایک طریقے کے جو خدا کا بھکاری بن کر سینٹ فرانسس کی طرح
اختیار کیا جاتا ہے۔ بعض گھروں سے وہ بڑے مُہذّب طریقے سے نکالے گئے۔ بعض جگہ
ملازموں نے اُن کی توہین کی، کسی جگہ اُن پر گھر کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ بہت دیر تک پھرتے
رہنے کے بعد وہ تھکن سے چور ہو کر سڑک کے کنارے بیٹھ گئے۔ مقابل کی ایک کھڑکی
سے انھیں کسی نے دیکھا اور دریافت کیا کہ آپ اس مذہبی مجلس میں کہیں کے نمائندے
تو نہیں ہیں۔ وہ گھر کے اندر بلا لئے گئے اور اس دفعہ پھر تقدیر نے اُن کے لئے ایک
ایسی ہستی (مسز جی۔ ڈبلیو۔ ہیل) ڈھونڈ نکالی جس کا شمار بعد میں اُن کے مخلص ترین امریکی
پیروؤں میں ہوا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد انھیں مذہبی اجتماع میں پہونچا دیا گیا۔ انھیں بڑی
خوشی سے ایک مندوب تسلیم کر لیا گیا اور کانفرنس کے دوسرے مشرقی نمائندوں کیساتھ ٹھہرا دیا گیا۔

اُن کا یہ مہمات سے بھرا ہوا سفر جو تقریباً تباہی پر ختم ہونے والا تھا۔ انھیں ایک بندرگاہ تک لایا لیکن اس لئے نہیں کہ آرام کریں۔ عمل انھیں آواز دے رہا تھا اور اب جب تقدیر ساری خرابیاں لا چکی تھی عزمِ محکم کا وقت آیا تھا۔ کل جو گمنام تھا، بھکاری تھا، جسے ایک مجمع جس میں خود دنیا کی چھ قوموں کی تلچھٹ ملی ہوئی ہے اس کے کالے رنگ کی وجہ سے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، پہلی ہی نظر میں، وہ اپنی حاکمانہ ذہانت سب پر مسلط کر دینے والا تھا!

• • • • • •

دوشنبہ ۱۱ ستمبر ۱۸۹۳ء کو مذہبی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس شروع ہوا۔ وسط میں کارڈنل گنبس تشریف فرما تھے۔ اُن کے گرد بائیں اور داہنی جانب مشرق کے مندوب برہمو سماج کے رہنما پرتاپ چندر مزمدار، ویویکانند کے ایک پرانے دوست تھے جو بمبئی کے ناگرکر کے ساتھ ہندوستان کے وحدت پرستوں کی نمائندگی کر رہے تھے، دھرم پال تھے جو سیلون کے بودھوں کے نمائندے تھے، جینیوں کے ترجمان گاندھی[1] تھے، چکرورتی اور اینی بسنٹ تھیوسافسٹوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ لیکن انھیں کے درمیان یہ نوجوان بھی تھا جو کسی کا نمائندہ نہیں تھا اور سب کا تھا۔ اس کا کوئی فرقہ نہ تھا بلکہ وہ پورے ہندوستان کا تھا جس پر مجمع کے ہزارہا انسانوں کی نگاہیں پڑ رہی تھیں، ویویکانند کے دلکش چہرے، بلند قد و قامت اور شاندار لباس نے اُن کے ایک داستانی شاہ کی خیالی تصویر میں اضافہ کر دیا تھا اور اُن کے جذبات کو اپنے اندر چھپا

---

[1] ظاہر ہے کہ یہ ہمارے مشہور موہن داس کرم چند گاندھی نہیں تھے جو اس زمانے میں جنوبی افریقہ میں قیام پذیر تھے۔ لیکن اُن کے خاندانی تعلقات جینیوں سے تھے اور یہ بہت ممکن ہے کہ یہ جینی مندوب ان کا دور کا رشتہ دار بھی ہو۔

لیا تھا۔ انھوں نے اس پہ پردہ نہیں ڈالا، یہ ان کے لئے پہلا موقع تھا کہ ایسے اجتماع کے سامنے تقریر کریں اور جب ایک کے بعد ایک نمائندہ سامنے آکر عوام کے ایک مختصر سے خطبہ میں اپنا تعارف کراتا، وویکانند نے گھنٹوں اُسے ٹالے رکھا، یہاں تک کہ دن ختم ہونے کو آیا۔

لیکن انھوں نے جو تقریر کی وہ گویا شعلہ کی لو تھی۔ بے جان تقریروں کے مُردہ ملبے میں ان کی تقریر نے سامعین کی رُوحوں میں ہیجان پیدا کر دیا۔ ابھی انھوں نے مشکل ہی سے اپنے ابتدائی الفاظ "امریکہ کی بہنو اور بھائیو!" ختم کئے تھے کہ سیکڑوں آدمی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور تالیاں بجانے لگے۔ انھیں حیرت تھی کہ کیا یہ لوگ انھیں کے لئے نعرۂ تحسین بلند کر رہے ہیں یقیناً وہ پہلے شخص تھے جس نے جلسہ کی رسمیت کی نقاب اتار پھینکی تھی اور عوام سے اس زبان میں گفتگو کر رہا تھا جس کے وہ منتظر تھے۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ انھوں نے سب سے کم عمر قوم کا قدیم ترین راہبانہ طرز سے یعنی سنیاسیوں کے ویدک طبقہ کے انداز میں، خیر مقدم کیا۔ انھوں نے ہندو مذہب کو تمام مذاہب کی ماں کی حیثیت سے پیش کیا جس نے اس دوسرے اصول کی تلقین کی تھی: "ایک دوسرے کو سمجھو اور تسلیم کرو!" انھوں نے مقدس کتابوں سے دو خوبصورت جملے سنائے:

"جو بھی میرے (خدا کے) پاس آتا ہے، چاہے کسی صورت میں آتے، میں اُس سے مل لیتا ہوں۔"

"تمام انسان ان مختلف راہوں میں جدوجہد کرتے ہیں، جو آخر کار میرے ہی پاس پہنچاتی ہیں۔"

ہر مقرر نے اپنے خدا، اپنے فرقہ کے خدا کی بات کی تھی، تنہا انھوں نے سب کے خداؤں کا تذکرہ کیا اور ان سب کو ایک آفاقی وجود میں سمو دیا۔ یہ رام کرشن (پرم ہنس) کی آواز تھی جو ان کے عظیم المرتبت شاگرد کے مُنھ سے نکل کر تمام حدوں کو توڑ رہی تھی۔ مذہبی مجلس نے نوجوان مقرر کو

تالیاں بجا کر خراجِ تحسین پیش کیا۔

بعد کے دنوں میں انھوں نے پھر تقریباً دس بارہ دفعہ تقریریں کیں اور ہر دفعہ نئی دلیلوں لیکن اسی جوشِ یقین کے ساتھ ایک لازمان و مکان عالمگیر مذہب کا نظریہ دُہرایا، جو وحشیوں کی اشیاء پرستی سے لے کر جدید سائنس کے نہایت آزاد تخلیقی معتقدات تک ہر قسم کے روحانی عقیدے کو متحد کرتا ہے۔ انھوں نے سب کو ایک عظیم الشان امتزاج سے ہم آہنگ کر دیا جس میں کسی ایک کی اُمیدوں کو ختم کرنا تو درکنار ہر ایک کے لئے اپنی فطرت کے مطابق بڑھنے اور پھیلنے کی بشارت تھی۔ اب اس کے سوا کسی اور عقیدے کی ضرورت نہ تھی کہ ہر انسان میں الوہیت پوشیدہ ہے اور اس کا ارتقا لامحدود ہے۔

"ایک ایسا مذہب پیش کرو اور ساری دنیا تمھاری پیروی کرے گی۔ شہنشاہ اشوک نے جو اجتماع کیا تھا وہ بودھوں کا اجتماع تھا، اکبرِ اعظم کا اجتماع اگرچہ اس مقصد سے زیادہ قریب تھا لیکن محض ایک خلوت خانہ کا اجتماع تھا۔ یہ بات صرف امریکہ کے لئے مخصوص ہو چکی تھی کہ وہ دنیا کے ہر گوشے میں اس بات کا اعلان کرے کہ خدا ہر مذہب میں موجود ہے۔

"خدا کرے وہ جو ہندوؤں کا برہم، زردشتیوں کا اہورا مزدا بودھوں کا بدھ، یہودیوں کا یہوواہ اور مسیحیوں کا آسمانی باپ ہے، تم سب کو طاقت بخشے ......عیسائی کے لئے ہندو یا بودھ ہو جانا ضروری نہیں، نہ ہندو اور بودھ کیلئے عیسائی ہو جانا، لیکن ہر ایک کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ دوسرے کے روحانی جوہر کو اپنے اندر جگہ دے اور اس کے ساتھ اپنی انفرادیت کو بھی اس طرح برقرار رکھے کہ اس کی ترقی خود اس کے قانون اور تقاضہ کے مطابق ہو...... اس مذہبی مجلسِ اعلیٰ نے ثابت کر دیا ہے کہ تقدس، پاکیزگی اور نکوکاری دنیا کے کسی ایک مذہب کی مخصوص ملکیت نہیں ہیں اور ہر مسلک نے اعلیٰ کردار کے

مرد اور عورت پیدا کئے ہیں .... مزاحمت کے باوجود ہر مذہب کے جھنڈے پر بہت جلد یہ لکھا ہوگا، 'جنگ نہیں اعانت'، 'تباہی نہیں میل جول'! 'اختلاف نہیں صلح پسندی اور ہم آہنگی'!"

اِن پُرزور الفاظ کا اثر غیر معمولی تھا۔ مذہبی پارلیمنٹ کے سرکاری اور مستند نمائندوں کی موجودگی میں یہ الفاظ ساری دُنیا سے کہے گئے تھے اور ہر خیال کو دعوتِ فکر دیتے تھے وویکانند کے خیالات بہت جلد تمام ملکوں میں پھیل گئے اور اس سے مجموعی طور پر ہندوستان کو فائدہ پہنچا۔ امریکی پریس نے انھیں "مذہبی مجلس کی بلاشبہ سب سے اہم شخصیت" قرار دیا اور لکھا کہ "ان کی باتیں سُننے کے بعد ہم کو یہ بات احمقانہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسی عالم قوم میں اپنے مذہبی مُبلّغ بھیجیں۔"

اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس طرح کا اعتراف عیسائی مبلغوں کے کانوں کو خوشگوار نہیں معلوم ہوا ہوگا۔ وویکانند کی کامیابی نے ان لوگوں میں بہت تلخ معاندانہ جذبات پیدا کردیئے جس میں انھوں نے بہت ذلیل حربوں سے کام لینے سے بھی گریز نہیں کیا۔ بعض ہندو نمائندوں کے دل میں بھی کچھ کم حاسدانہ جذبات نہیں پیدا ہوئے کیونکہ انھوں نے دیکھا کہ اس "کوچہ گرد جوگی" نے جس کے پاس نہ کوئی بڑی سفارش ہے نہ لقب، ان کو تاریکی میں ڈال دیا ہے۔ خاص کر تھیوسانی کے ماننے والوں نے جنھیں وویکانند نے نہیں بخشا تھا، انھیں کبھی معاف نہیں کیا۔

لیکن اُبھرتے ہوئے سورج کی ترقی کرتے ہوئے شکوہ نے سایوں کو ختم کردیا اور وویکانند کی شخصیت عہد آفریں بن گئی۔

اپنی اس فتح مندی کے متعلق خود ان کا کیا خیال تھا؟ وہ روتے تھے۔ کوچہ گرد جوگی نے

محسوس کیا کہ اس کی تنہا اور ساکرا وزندگی کا جو تعلق خدا سے تھا وہ ختم ہو گیا۔ کیا کوئی ایسی مخلص مذہبی روح ہوگی جو اُن کے رنج سے ہمدردی نہ کرے؟ انھوں نے خود اس کی خواہش کی تھی ...... یا شاید اس نامعلوم قوت نے جو انھیں اس مشن پر بھیجنے کا باعث ہوئی تھی اُن سے اس کی خواہش کی ...... لیکن اُن کے ساتھ ہمیشہ ایک اندرونی آواز بھی رہتی تھی جو اُن سے کہتی تھی: "ہر چیز تج دو اور خدا کے ہو جاؤ!" وہ دوسری کو کسی حد تک چھوڑے بغیر ایک کو پوری طرح مطمئن نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ میعادی بحران جنھیں دویکانند کے سے طوفانی ذہن رکھنے والے کو جھیلنا پڑ رہا تھا اور وہ کرب جو بظاہر متضاد لیکن درحقیقت منطقی ہوتا ہے، ان یک رنگ لوگوں کے ذہن میں کبھی نہیں آسکتا جو صرف ایک ہی خیال اپنے ذہن میں بسائے رکھتے ہیں، اپنے افلاس کو ایک لازمی خوبی قرار دیتے ہیں اور جو دو فرصلاحیتیں رکھنے والی روحوں کو ہم آہنگ بنانے کی زبردست اور رحم انگیز جدوجہد کو ریاکاری یا پریشان خیالی قرار دیتے ہیں۔ دویکانند ایسی ہی کینہ ور تعبیرات کا شکار تھے اور ہمیشہ رہیں گے کیونکہ اُن کی شان عذر معذرت کی کوششوں سے بالاتر تھی۔

لیکن اس دفعہ ان کی اُلجھنیں صرف رُوحانی نہ تھیں، بلکہ حالات کے اندر ہی مضمر تھیں۔ پہلے کی طرح اس دفعہ بھی کامیابی کے بعد (اور شاید اسی وجہ سے اور زیادہ) اُن کا کام اور مشکل ہو گیا تھا۔ افلاس سے تقریباً بالکل مغلوب ہو جانے کے بعد اب وہ اس خطرے میں تھے کہ دولت اُن پر قابو نہ پالے۔ امریکی امارت پرستی نے اُن پر حملہ کر دیا اور اپنے پہلے سیلاب میں تعیش اور ٹیم ٹام کے ذریعہ اُن کا گلا گھونٹ دینے کی کوشش کی۔ دویکانند دولت کی فراوانی سے قریب قریب جسمانی طور پر بیمار ہو گئے۔ راتوں کو اپنے سونے کے

کرنے میں جب وہ اُن لوگوں کا خیال کرتے جو بھوک سے مر رہے ہیں تو فرش پر لوٹتے اور
مایوسی سے آہیں بھرتے تھے۔ وہ دردناک انداز میں کہتے: "اے ماں! میں یہ شہرت
لے کر کیا کروں گا جب میرے ہموطن زبوں حالی کا شکار ہیں!"

اپنے بدقسمت وطن ہندوستان کی خدمت کرنے اور اپنے دولت مند مربّیوں کی
سرپرستی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے انھوں نے ایک لکچروں کا انتظام کرنے
والی کمپنی (لکچر بیورو) کی یہ پیشکش قبول کر لی کہ وہ ریاست ہائے متحدہ کے مشرقی اور
وسطی مشرقی علاقوں، شکاگو، آیووا، دی موئینس، سینٹ لوئی، منیاپولس، ڈیٹرائٹ
بوسٹن، کیمبرج، بالٹی مور، واشنگٹن اور نیویارک وغیرہ میں تقریریں کیں۔ لیکن یہ طریقہ
خطرناک ثابت ہوا کیونکہ یہ سمجھنا بالکل غلط تھا کہ دوسرے مقرروں کی طرح وہ بھی امریکی عوام
کو خوش کر کے شہرت اور دولت حاصل کرنے کی کوشش کریں گے!......

اس نئی جمہوریہ کی ناقابل شکست طاقت کے لئے ابتداءً اُن کے دل میں کشش اور
تحسین کا جو جذبہ پیدا ہوا تھا وہ سرد ہو چکا تھا۔ دویکانند نے بہت جلد اس ملک کی
ظالمانہ روش، عدم انسانیت، روحانی چھوٹے پن، کٹر عصبیت، کوتاہ العلمی، زبردست
قصورِ فہم سے ٹکر لی جسے مختلف انداز سے سوچنے اور زندگی کو دوسری نظر سے دیکھنے والوں
کے مقابلہ میں بنی نوعِ انسان میں اپنی قوم کے بہترین ہونے کا یقین اور ادّعا تھا......
اس لئے اب اُن میں صبر کی طاقت نہیں رہ گئی تھی۔ انھوں نے کسی بات کو پوشیدہ نہیں
رکھا بلکہ تشدّد، استحصال اور تباہی کی نمائندگی کرنے والی خصوصیات سے مملو مغربی تہذیب
کے جرائم اور عیوب کی مذمّت کی۔ ایک دفعہ جب وہ بوسٹن میں اپنے ایک محبوب موضوع پر
تقریر کرنے والے تھے، کاروباری اور دنیادار نمائشی سامعین کا مجمع دیکھ کر ایسی نفرت کا احساس

ہوا کہ انھوں نے اس کے تقدس کا احترام ضائع کرنا گوارا نہیں کیا اور کھرے پن سے اپنا موضوع بدل کر اس تہذیب پر خوفناک حملے کئے جس کی نمائندگی ایسے بھیڑیوں اور لومڑیوں سے ہوتی ہے۔ حادثہ زبردست تھا۔ سیکڑوں شور کرتے ہوئے ہال سے باہر نکل گئے اور اخبارات نے غم و غصّہ کا اظہار کیا۔

جھوٹی عیسائیت اور ریاکاری کے خلاف انھوں نے خاص طور سے تلخ گوئی سے کام لیا: "تمام لاف و گزاف کے باوجود تمھاری عیسائیت تلوار کے بغیر کہاں کامیاب ہوتی ہے؟ تمھارا مذہب دولت کے سایہ میں تبلیغ پا تا رہا ہے۔ میں نے یہاں جو کچھ سُنا ہے وہ سب ریاکاری سے بھرا ہوا ہے۔ یہ خوش حالی! کیا یہ مسیح کی جانب سے ملی ہے؟ جو لوگ مسیح کا نام لیتے رہتے ہیں، دولت جمع کرنے کے علاوہ اور کسی چیز کی فکر نہیں کرتے! تمھارے درمیان تو مسیح کو ایک پتھر کا ٹکڑا بھی نہیں ملے گا جس پر وہ اپنا سر ٹکا سکیں ...... تم مسیحی نہیں ہو، مسیح کی طرف پلٹ جاؤ!"

اس ذلّت آمیز نصیحت کا اثر تھا غصّہ کا زبردست دھماکا۔ اس وقت سے پادریوں کا ایک گروہ ہمیشہ اُن کے پیچھے لگ گیا جو الزام اور اتہام کے ساتھ ان کا تعاقب کرتا رہا یہاں تک کہ اس نے امریکہ اور ہندوستان میں اُن کی زندگی اور اعمال کے متعلق نفرت انگیز افترا پردازیاں کیں۔ بعض حریف جماعتوں کے ہندو نمائندوں کا طرزِ عمل بھی کچھ کم شرمناک نہ تھا جو اُن کی کامیابی سے جل رہے تھے، انھوں نے اس میں بھی تامّل نہ کیا کہ کینہ پرور پادریوں کے لگائے ہوئے ذلیل الزامات کی تشہیر کریں۔ عیسائی مشنری حاسد ہندوؤں کے مہیّا کئے ہوئے ہتھیار استعمال کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے اور ایک مضحکہ خیز جوش کے ساتھ اس آزاد سنیّاسی (وویکانند) پر ہندوستان میں الزام رکھتے تھے کیونکہ امریکہ میں وہ ہندو مذہب کے مقرّرہ قوانین

کا پابند نہیں رہا تھا۔ وویکانند اپنے شاگردوں کے ہندوستان سے بھیجے ہوئے بدحواس خطوں میں مذہب پرستوں کی اٹھائی ہوئی لہروں کی جھاگ کے اثرات کو بڑی حقارت سے دیکھتے تھے۔

اُن کے ایک امریکی چیلے سوامی کرپانند (لیون لینڈس برگ) کے ایک خط سے ریاست ہائے متحدہ میں اُن کی مصیبتوں کے گذشتہ واقعات کی عکاسی ہوتی ہے: "نیم مذہبی انسانیت سوز حرکات کا یہ اکھاڑا جسے غیر معتدل، پُراسرار اور انوکھی باتوں کی مریضانہ پیاس نے بے چین کر رکھا ہے اور جہاں ایک احمقانہ خوش اعتقادی کے تحت سیکڑوں انجمنیں کھیل جاتی ہیں جس میں ہر طرح کے بد روحوں، بھوتوں، مہاتماؤں، جھوٹے پیمبروں کو پناہ مل جاتی ہے، وویکانند کے لئے ایک نفرت خیز مقام تھا۔ انھوں نے خود کو اس بات پر مجبور پایا کہ شروع ہی میں اس گندے اصطبل کو صاف کریں۔"

اُن کے شروع کے لکچروں میں جو بے فکرے، مسخرے، گندگی اچھالنے والے اور احمق جمع ہو گئے تھے اُن کو انھوں نے شیطان کے حوالے کیا۔ اسی وقت سے انھیں بعض جماعتوں کے نذرانے، وعدے، دھمکیاں اور جھوٹے مذہب پرستوں، خدائی فوجداروں اور سازشیوں کے ڈرا کر کام لینے والے خطوط ملنے لگے۔ اُن کے ایسا کردار رکھنے والے پر ان باتوں کا کیا اثر ہو سکتا تھا، یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ معمولی سا غلبہ بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لئے انھوں نے کسی ایک جماعت سے اتّحاد کر کے دوسری کا مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا اور کئی بار بغیر کسی سہارے کے انھوں نے اُن اتحادیوں کے خلاف جدّوجہد کرنے کا کھلا ہوا موقع نکال لیا جو انھیں اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

اس جگہ امریکہ کے اعزاز میں یہ کہنا ضروری ہے کہ وویکانند کی اخلاقی جُرأت، جاندار نصب العین اور بے خوف ایمان واری دیکھ کر ہر طرف سے کچھ چُنے ہوئے محافظ اور مُعرّف اُن کی طرف کھنچ آئے، جن کے ایک گروہ نے اُن کے پہلے مغربی شاگردوں کی حیثیت اختیار کر لی اور انسانی بیداری کے باعمل نقیب ثابت ہوئے۔

امریکہ میں تبلیغ

ووِیکانند نے مشکل ہی سے اپنے مواعظ شروع کیے ہوں گے کہ اُن کے پیام کے پیاسے مرد اور عورت اُن کے اِرد گرد جمع ہونے لگے۔ وہ ہر جگہ سے آتے تھے، تہذیبی محفلوں سے اور یونیورسٹیوں سے، سچے اور مخلص عیسائی، سنجیدہ آزاد خیال مفکّر اور دہریئے سبھی۔ جو چیز ووِیکانند کو حیرت زدہ کرتی تھی اور جو ہمیں آج بھی متحیّر کرتی ہے، وہ تھی اس نئی اور پرانی دنیا میں، ایک معمّہ کے طور پر پہلو بہ پہلو مستقبل کے متعلق امید اور خوف کی موجودگی، زبردست اور اعلیٰ پایہ کی شر انگیز قوتوں کی موجودگی، سچائی اور جھوٹ دونوں کی زبردست پیاس، دولت کی ناپاک پرستش اور مکمل بے تعلّقی، بچوں کا سا خلوص اور میلے کا سا عامیانہ پن۔ غصّے کے اچانک اظہار کے باوجود جس کا میلان اُن میں موجود تھا، ووِیکانند میں اتنی عظمت تھی کہ وہ ہمدردی اور مخالفت کے درمیان توازن قائم رکھ سکیں۔ انھوں نے اینگلو سیکسن امریکہ کی حقیقی قوّت اور خوبی کا ہمیشہ اعتراف کیا۔

حقیقت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو انھوں نے اس سرزمین پر کبھی اتنا استقلال محسوس نہیں کیا جتنا بعد میں انگلستان میں محسوس کیا حالانکہ یہاں انھوں نے

یورپ سے کہیں زیادہ پائدار کاموں کی بنیاد رکھی۔ لیکن نئے امریکہ کی کوئی پُرعظمت چیز ایسی نہ تھی جس کو انھوں نے احترام سے نہ دیکھا ہو اور جسے اس نظر سے سمجھنے کی کوشش نہ کی ہو کہ اسے اپنے ہموطنوں کے سامنے تقلید کے لئے پیش کر سکیں، جیسے اُن کی اقتصادی پالیسی، صنعتی تنظیم، جمہوری تعلیم، عجائب خانے اور آرٹ گیلری، سائنس کی ترقی، حفظانِ صحت کے ادارے اور سماجی فلاح کے کام۔ جب وہ امریکہ کے اس آخر الذکر کام اور جمہور کے مفاد کے لئے فیاضی سے ان پر روپیہ خرچ کرنے کا مقابلہ اپنے ملک کی سماجی بے حسی سے کرتے تھے تو اُن کا چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا کیونکہ مغرب کے ظالمانہ غرور پر ہر وقت تازیانہ لگانے کے لئے تیار رہنے کے باوجود وہ مغرب کے سماجی فلاح کے کاموں کو مثال میں پیش کر کے ہندوستان کی تذلیل کرنے پر اُس سے زیادہ آمادہ رہتے تھے۔

ایک بار جب وہ عورتوں کے ایک مثالی قید خانہ سے باہر نکلے جہاں مجرموں کے ساتھ انسانیت کا برتاؤ کیا جاتا تھا تو اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں غریبوں، کمزوروں اور بے بسوں کے ساتھ بے رحمانہ برتاؤ کا خیال کر کے اُن کی زبان سے نکلا: "اُف! وہ قصّاب! دنیا میں کوئی مذہب انسانی عظمت کی تبلیغ ہندو مذہب سے زیادہ بلند پایہ طریقہ سے نہیں کرتا اور نہ دُنیا کا کوئی مذہب ہندوازم سے زیادہ گرے ہوئے غریبوں کی گردنوں پر قدم رکھ کر انھیں کچلتا ہے۔ اس میں مذہب کی کوئی خطا نہیں ہے، خطا فریسیوں اور صدوقیوں (ریاکار علماء) کی ہے۔"

اس لئے وہ ہندوستانی نوجوانوں سے التجا کرنے، انھیں جوش دلانے اور اُن سے اصرار کرنے سے کبھی باز نہ آتے تھے:

"میرے نوجوانو! اپنی کمریں کس لو! میں خدا کی طرف سے اسی کے لئے مامور ہوا ہوں...... ساری امیدیں تمھیں سے وابستہ ہیں، تم جو نیک دل، فروتن لیکن ایمان دار ہو... غریبوں کا درد محسوس کرو اور آئی کی مدد پر تیار رہو، مدد آئے گی ...... میں بارہ سال تک اپنے دل پر بوجھ اور اپنے سر میں یہ خیال لئے گھومتا رہا ہوں۔ میں نام نہاد امیروں اور بڑے لوگوں کے دروازے گیا ہوں۔ ایک خون آلودہ دل لئے ہوئے آدھی دنیا کا سفر کر کے میں اس اجنبی ملک میں مدد کے لئے آیا ہوں ...... خدا میری مدد کرے گا۔ ممکن ہے میں اس ملک میں ٹھنڈک اور بھوک سے مر جاؤں لیکن نوجوانو! میں تم سے رحم دلی اور جاہلوں، مظلوموں اور غریبوں کی اعانت کی التجا کرتا ہوں...... اپنے سر جھکائے ہوئے خدا کے سامنے جاؤ اور عظیم قربانی دو...... (غریبوں کے لئے) اپنی پوری زندگی کی قربانی، ان تیس کروڑ انسانوں کے لئے قربانی جو روز بروز نیچے ہی گرتے جا رہے ہیں ...... خدا کی ذات بلند ہو! ہم کامیاب ہو کر رہیں گے ...... اس جدوجہد میں سیکڑوں گر جائیں گے اور سیکڑوں اُن کی جگہ لینے کو تیار ہوں گے..... ایمان اور ہمدردی! زندگی کوئی چیز نہیں، موت کوئی چیز نہیں، خدا کی ذات بلند ہو! آگے بڑھو، وہی ہمارا سپہ سالار ہے۔ پیچھے مڑ کر یہ نہ دیکھو کہ کون گر گیا...... بڑھتے جاؤ، آگے قدم اٹھاتے جاؤ!......"

یہ زبردست خط جو سماجی فلاح کے لئے امریکہ کی انسان دوستی سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا، ایک ایسے اُمید بھرے اشارے پر ختم کیا گیا تھا جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جو شخص عیسائی مذہب کے ریاکار زاہدوں پر کوڑے برسا سکتا تھا، وہ دوسروں کے مقابلہ میں "بابرکت محبت" کی سانسیں محسوس کر کے اسی عقیدے میں اپنے خلوص سے جان ڈال سکتا

تھا: "میں یہاں ابنِ مریم کے بچّوں میں ہوں اور یسوع مسیح ہی میری مدد کریں گے۔"
وہ اس قسم کے انسان نہیں تھے جو مذہبی حد بندیوں سے اُلجھن محسوس کرتا ہے
انھوں نے تو اس زبردست سچائی کا ذکر کیا: "ایک مذہبی عقیدے میں پیدا ہونا ٹھیک ہے لیکن اس میں مرجانا قیامت ہے۔"

اُن عیسائی اور ہندو کٹّر منتقیوں کے اتہام آمیز شور و غل کے جواب میں، جو خود کو اس کا ذمّہ دار سمجھتے تھے کہ اپنے مخصوص عقائد کے بند دروازوں کو کافروں سے محفوظ رکھیں، انھوں نے یہ کہا: "میں اس کی پروا نہیں کرتا کہ وہ لوگ ہندو، مسلمان یا عیسائی ہیں، وہ جو بھی ہوں لیکن خدا سے محبت کرتے ہوں تو میں ہمیشہ اُن کی خدمت کے لئے تیار ہوں۔ میرے بچّو! آگ میں کود پڑو...... اگر تمھارے پاس ایمان ہے تو ہر چیز خود تمھارے پاس آئیگی ہم میں سے ہر ایک کو ہندوستان کے اُن لاکھوں مظلوموں کے لئے دعا کرنا چاہئے جنھیں مفلسی، ملّائیت اور ظلم نے گھیر رکھا ہے، اُن کے لئے دن رات دعا کرنا چاہئے...... میں الٰہیات کا عالم، فلسفی یا سنت نہیں ہوں، میں ایک مفلس ہوں اور مفلسوں سے محبت کرتا ہوں...... ہندوستان میں کوئی ہے جو اُن بیس کروڑ مردوں اور عورتوں کا درد محسوس کرے جو غریبی اور جہالت میں گرفتار ہیں؟...... اُن کی دنیا کون روشن کریگا؟ انھیں لوگوں کو اپنا خدا سمجھو، میں اُنھیں کو مہاتما کہوں گا جن کا دل غریبوں کے لئے خون ہو رہا ہو۔ جب تک یہ کروڑوں انسان بھوکے اور جاہل ہیں، میں ہر اُس شخص کو غدّار قرار دوں گا، جس نے اُن کے بل پر تعلیم پائی ہے لیکن اُن کی طرف ذرا بھی توجّہ نہیں دیتا!"......

اس طرح وہ ایک دن بھی اپنے مشن کے ابتدائی مقصد کو نہیں بھولے، وہی جس کے شکنجوں نے انھیں اُس وقت بھی اپنے اندر کس رکھا تھا جب انھوں نے ہمالیہ سے راس کماری

تک، شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال تک کی یاترا کی تھی تاکہ اپنی قوم کے جسم اور رُوح (پہلے جسم، پہلے روٹی!) کو بچا سکیں، اپنی اپیل کو وسعت دے کر اُسے اس طرح عوام کا مقصد بنائیں کہ ساری دنیا اُن کی مدد کے لئے منظم ہو جائے اور یہ مقصد ساری دنیا کے غریبوں اور مظلوموں کا مقصد ہو۔ داد و ستد ہونا چاہیئے! اب ایسا نہ ہو کہ جو ہاتھ خیرات کے لئے پھیلیں وہ خالی نیچے گر جائیں، مساوات ہونی چاہیئے! جو کچھ پاتا ہے وہ دیتا ہے اور جو اگر زیادہ نہیں تو کم سے کم اتنا ہی دیتا ہے جتنا پاتا ہے، وہ زندگی پاتا ہے، زندگی دیتا ہے اور خدا بھی دیتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے سارے مفلس، بے نوا اور مسکین خدا ہیں (یعنی اُن کے اندر خدا ہے) جو مصائب اور مظالم لوگوں کو مدّتوں سے پیس رہے ہیں، اُنکیں کے بوجھ کے نیچے نیچے دائمی روحانیت کی شراب بہہ رہی ہے، اُس میں خمیر اُٹھ رہا ہے اور اُس کی تندی بڑھ رہی ہے۔ اسے لے لو اور پیو! اس کے لئے وہ مقدّس الفاظ بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں: "کیونکہ یہ میرا خون ہے!" یہ لوگ قوم کے مسیح ہیں۔

اس طرح وویکانند کی نگاہ میں اس کام کی نوعیت دُہری تھی: ہندوستان تک وہ اشیاء اور دولت پہونچانا جو مغربی تمدّن سے ہاتھ آئیں اور مغرب تک ہندوستان کے رُوحانی خزانوں کی ترسیل۔ یہ ایک مخلصانہ مبادلہ تھا، ایک طرح کی باہمی اور برادرانہ اعانت۔

وہ صرف مغرب کے مادّی سامانوں کو اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ سماجی اور اخلاقی تصورات کو بھی۔ ہم نے ابھی اُن کے وہ ولولہ انگیز الفاظ پڑھے ہیں جو انسانی جذبہ کے ماتحت ایک عظیم المرتبت خوددار قوم اُن لوگوں کے لئے کہنے پر مجبور ہوئی جسے وہ قصوروار ٹھہرا رہی تھی۔ وہ ٹریم وے میں ایک لکھ پتی اور ایک مزدور عورت کو ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے دیکھ کر ظاہری جمہوری مساوات کی تعریف و توصیف کے جذبے سے بھر جاتے تھے جو تمام گرے ہوؤں کو

پلیس ڈالتی ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہندوستان میں نوابوں اور اچھوتوں کی ظالمانہ نابرابری کو اور زیادہ شدت سے محسوس کرتے تھے۔ انھوں نے لکھا کہ "ہندوستان کے مستقبل پر اسی دن مُہر لگ گئی جب اُس نے غیر ہندو کے لئے ملیکش (ملچھ) کا لفظ ایجاد کیا اور دوسروں سے میل جول بند کر دیا۔"

وہ اس اوّلین ضرورت کی تبلیغ کرتے تھے کہ ایک ایسی تنظیم ہونی چاہیئے جو مغربی جمہوریتوں کے انداز پر ہندوؤں کو امداد باہمی کے اصول سکھائے۔ وہ اُن امریکی خواتین کے بھی معترف تھے جنھوں نے اعلیٰ دماغی صلاحیتیں حاصل کی تھیں اور اپنی آزادی کو شریفانہ استعمال کرتی تھیں۔ وہ ان کی آزادی کا مقابلہ ہندوستانی عورت کی علاحدگی پسندی سے کرتے تھے اور اپنی مرجانے والی بہنوں کی پوشیدہ اذیتوں کو یاد کر کے، اُن کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کو وہ ایک خوشگوار کام سمجھتے تھے۔

انھیں کسی قسم کی نسلی برتری کا احساس مختلف طریقوں سے مغرب کی برتری کا اعتراف کرنے سے مانع نہ آتا تھا کیونکہ وہ اپنے ملک کو اس سے فائدہ پہنچانا چاہتے تھے۔

اُن کی شان برابری کے تبادلہ کے علاوہ کسی اور شکل میں کچھ اور لینا پسند نہ کرتی تھی۔ انھیں اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ وہ مغربی ملکوں کو، جو اپنے عمل اور عملیت پسندی (جسے وہ مادّی عقل کہتے تھے!) کے جال میں خود پھنس گئے ہیں، روح کی آزادی اور انسان کے اندر خدا تک پہنچنے کی وہ کنجی پیش کر رہے ہیں جو ہندوستان کے کنگال سے کنگال آدمی کے پاس بھی موجود ہے۔ انسان پر عقیدہ، جو امریکہ کے نوجوان میں بڑی ترقی یافتہ شکل اختیار کر چکا تھا، اُن کے لئے پہلا زینہ تھا جس پر وہ حملہ آور ہو سکتے تھے۔ اُسے گھٹانے کی کوشش کرنے کے بجائے جیسا کہ یوروپی مسیحیوں کے بعض اداروں نے کیا تھا، اُن کی عقل نے اس اچھے

خانوادہ کی چھوٹی بہن (امریکہ) میں اس کے وجود کو تسلیم کیا لیکن یہ بھی دیکھا کہ اس نئے سورج نے اُسے ایسا چکا چوند کر دیا ہے کہ وہ آنکھ بند کر کے تیز قدم اٹھاتی ہوئی غار کے مُنھ پر پہونچ رہی ہے۔ انھیں یقین تھا کہ وہ اسے روشنی بخشنے پر مامور کئے گئے ہیں تاکہ اُسے آگے بڑھا کر زندگی کے اُس دریچے تک پہنچا دیں جہاں سے خدا کو دیکھا جا سکتا ہے۔

• • • • • •

اس لئے امریکہ میں انھوں نے پیمبرانہ مہمیں اس مقصد سے شروع کیں کہ اس افتادہ ذہن کے وسیع روحانی قطعہ میں ویدانتی افکار کے بیج ڈالیں اور انھیں رام کرشن (پرم ہنس) کے عالمگیر محبّت کے پانی سے سینچیں۔ ویدانتوں میں سے انھیں وہ حصے خود منتخب کرنے تھے جو اپنے منطقی استدلال کی وجہ سے امریکی ذہن سے مطابقت رکھتے تھے۔ اپنے گرو کے ذکر سے انھوں نے پرہیز کیا حالانکہ وہ انھیں کے خیالات کی تبلیغ کر رہے تھے۔ یہ فروگذاشت شدتِ محبّت سے پیدا ہونے والی حیاداری کا نتیجہ تھی اور جب بعد میں انھوں نے اپنے چند مخصوص شاگردوں سے اس کا براہ راست ذکر بھی کیا تو انھیں اس بات سے روک دیا کہ وہ محبّت کے اس پُراثر عمل کا ذکر عوام سے کریں۔

بہت جلد انھوں نے ان امریکی لکچر دلانے والے اداروں سے چھٹکارا حاصل کر لیا جن کے منتظم سفر کا پروگرام مرتّب کرتے تھے اور اپنے پروپیگنڈے اور اشتہار بازی کے ڈھول پیٹ کر انھیں سرکس کے کھلاڑی کی طرح پیش کر کے پریشان کرتے تھے۔ ڈِٹرائٹ میں جہاں وہ ۱۸۹۴ء میں تقریباً چھ ہفتے ٹھہرے، انھوں نے ان پابند کرنے والے پروگراموں کا ناقابلِ برداشت جُوا اتار پھینکا۔ انھوں نے دوستوں سے درخواست کی کہ وہ سب معاہدے منسوخ کرا دیں اگرچہ اس میں زبردست مالی نقصان تھا۔ ڈِٹرائٹ ہی میں اُن کی اس خاتون سے

ملاقات ہوئی جو سسٹر نویدتا (مس مارگریٹ نوبل) کی طرح اُن کے تمام مغربی چیلوں میں اُن کے خیالات و افکار کے سب سے زیادہ قریب تھی۔ اُس نے خود کو سسٹر کرسٹین (مس گرینیٹا منڈل) کے نام سے موسوم کیا۔

۱۸۹۵ء کے جاڑوں کے شروع میں جب وہ ڈیٹرائٹ سے نیویارک واپس آئے تو شروع شروع وہ چند دوستوں ہی کے حلقہ میں گرفتار رہے جنھیں اُن کے پیام سے زیادہ اُن کی مشہور ہوتی ہوئی شخصیت سے دلچسپی تھی۔ لیکن وہ زیادہ پابندیاں برداشت نہ کرسکے، وہ تنہا رہنا اور اپنے آپ مالک بننا چاہتے تھے۔ وہ اس طرح کی کھائیاں پھاندنے والی گھوڑ دوڑ سے گھبرا گئے تھے جس سے کوئی مستقل نتیجہ نہیں نکل رہا تھا، انھوں نے طے کیا کہ وہ شاگردوں کا ایک حلقہ بنا کر ایک آزاد تعلیمی نصاب شروع کریں گے۔ دولتمند دوستوں نے ناقابلِ برداشت شرطیں لگا کر مالی اعانت کی پیشکش کی، وہ گویا اُنھیں اس پر مجبور کر رہے تھے کہ وہ "ٹھیک قسم کے لوگوں" ہی کی ایک مخصوص جماعت سے ملیں۔ وہ غصّہ میں آپے سے باہر ہو گئے اور چلّائے: "شیو! شیو! کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی عظیم الشان کام دولتمندوں کے ہاتھوں انجام پائے! روپوں کی تھیلیاں نہیں، دل اور دماغ تخلیق کرتے ہیں......"

کچھ وفادار اور نسبتاً غریب طالب علموں نے کام کی مالی ذمہ داری سنبھال لی۔ ایک "ناپسندیدہ" علاقے میں چند گندے کمرے کرائے پر لئے گئے جن میں کوئی سامان بھی نہ تھا جہاں جس کا جی چاہتا بیٹھ جاتا۔ وویکانند فرش پر بیٹھتے تھے، دس بارہ کھڑے رہتے تھے۔ پھر اس کی ضرورت پیش آئی کہ زینے پر جانے والا دروازہ کھول دیا جائے، لوگ سیڑھیوں اور درمیانی چبوتروں پر بھر جاتے۔ تھوڑے ہی دنوں میں انھوں نے اُپنشدوں کی تفسیر بیان کی۔ وہ ہر روز چند منتخب شاگردوں کو راج یوگ اور گیان یوگ کے دُہرے طریقوں کا سبق

ذریعے تھے: پہلا طریقہ خاص طور سے نفسیاتِ طبعی سے تعلق رکھتا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ جسم کو دماغ کے تابع رکھ کر اور اپنی حیاتیاتی قوتوں پر قابو پاکر ان کا زحاصل کیا جائے، اندرونی لہروں کے ہیجان پر اس طرح سکون طاری کیا جائے کہ وجودِ مطلق کی صاف آواز کے سوا اور کوئی آواز نہ سُنائی دے۔ دوسرا طریقہ خالص ذہنی اور سائنسی عقلیت سے مشابہ تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ روح اور آفاقی قانونِ قدرت یا حقیقتِ مطلق میں ہم آہنگی تلاش کی جائے اِسے سائنسی مذہب بھی کہہ سکتے ہیں۔

جون ۱۸۹۵ء کے قریب انھوں نے راج یوگ پر اپنا مشہور رسالہ ختم کیا جسے وہ مس ایس۔ای۔ والڈو (بعد میں سسٹر ہری داسی) کو بول کر لکھا رہے تھے۔ اس رسالہ نے بعد میں ولیم جیمس کے سے امریکی ماہرِ عضویات کو متوجہ کیا اور کچھ مدّت گذرنے پر ٹالسٹائے نے اسے بالکل عملی یعنی مادّی طاقت پیدا کرنے کے مفہوم میں لیا۔ یہ نیو آسما توم جو بچوّں کا سا دماغ رکھتی ہے بالعموم ایسے ہی خیالات سے دلچسپی لیتی ہے جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتی ہے مابعد الطبیعاتی نظریئے اور مذہب چھوٹی عملی سائنس میں تبدیل کر لئے جاتے ہیں اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ طاقت، دولت اور صحت یعنی اس دُنیا کی بادشاہت حاصل کی جائے۔ وِویکانند کو اس سے زیادہ کسی اور چیز سے تکلیف نہیں پہونچ سکتی تھی۔ بات یہ ہے کہ سارے سچّے ہندو گروؤں کے یہاں روحانیت اپنا آپ مقصد ہے، اُن کا مکمّل مقصد اُسے حاصل کرنا ہے، وہ انھیں کبھی معاف نہیں کرسکتے جو اس کے حصول کو مادّی ذرائع پر قابو پانے کی خواہش کے تابع رکھتے ہیں۔ وِویکانند نے اس ناقابلِ معافی گناہ کی خاص طور سے نہایت تلخی کیساتھ مخالفت کی لیکن شاید یہ بہتر ہوتا کہ "شیطان کو رغبت نہ دلائی گئی ہوتی" بلکہ ابتدا میں امریکی ذہن کو دوسری راہوں پر لگایا گیا ہوتا۔ شاید اُنھوں نے خود اسے محسوس کیا کیونکہ آنے والے موسم سرما میں

انھوں نے دوسرے یوگ کے متعلق سبق دیئے۔ اس وقت وہ ابھی تجربے کی منزل ہی میں تھے۔ جوان گرو اپنی قوتوں کو ایک دوسری نسل کے لوگوں پر آزما رہا تھا اور ابھی وہ یہ طے نہیں کر سکا تھا کہ وہ اس قوت کو کس طرح استعمال کرے۔

اس کے فوراً ہی بعد (جون جولائی ۱۸۹۵ء میں) موسمِ گرما کے اُن ہفتوں میں جو چند وفادار شاگردوں کے ایک منتخب گروہ کے ساتھ تھاؤزنڈ آئی لینڈ پارک میں گزرے، مسٹر کرسٹین کی شہادت کے مطابق، وویکانند نے اپنے آئندہ لائحہ عمل کے متعلق قطعی فیصلہ کر لیا۔ دریائے لارنس کے اُوپر کے جنگلوں سے بھرے ایک علاقہ میں جو فیاضانہ ویدانتوں کی تشریح و تعلیم کیلئے وقف کر دیا گیا تھا، ایک پہاڑی پر ایک درجن منتخب شاگرد جمع ہوئے۔ انھوں نے اپنا مراقبہ یوحنا کی کتاب سے ایک حصہ پڑھ کر شروع کیا اور مکمل سات ہفتے تک وویکانند نے نہ صرف ہندوستان کی مقدس کتابوں کی تشریح کی بلکہ (اُن کی نظر میں تعلیم کے لئے جو بات اس سے زیادہ اہم تھی) اس کی کوشش بھی کی کہ جو نکو کار اُن کے قبضہ میں ہیں اُن میں رُوحانی قوت بیدار کریں۔ اُن کی بات چیت کے چند موضوعات یہ تھے جیسے آزادی، ہمت، عصمت، خود فریبی کا گناہ۔

انھوں نے اُبھے نند کو لکھا کہ "انفرادیت میرا اصولِ عمل ہے۔ افراد سے زیادہ کو تعلیم دینا میری نیت نہیں ہے۔"

ایک دفعہ پھر کہا: "اگر میں اپنی زندگی میں ایک فرد کو بھی آزادی حاصل کرنے میں مدد دے سکوں تو سمجھوں گا کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی۔"

رام کرشن کے وجدانی طریق کار کی تقلید میں وہ کبھی کبھی اس مبہم جماعت کے لئے جسے بہت سے مقرر اور واعظ "پبلک" کہتے ہیں، ایسی باتیں نہیں کہتے تھے جو اُن کے سروں کے اُوپر سے گزر جاتے، وہ جیسے ہر شخص سے الگ الگ تخاطب کرتے تھے کیونکہ جیسا کہ انھوں نے

کہا: "ہر شخص کے اندر پوری دُنیا ہوتی ہے"۔ ہر فرد کے اندر کائنات کا مرکز ہے۔ اگرچہ وہ ایک جماعت کے بانی تھے لیکن آخر وقت تک اصلاً ایک سنیاسی ہی رہے اور اُن کی خواہش یہ رہی کہ وہ سنیاسی یعنی خدا کے آزاد بندے ہی پیدا کریں۔ اس لئے امریکہ میں اُن کا شعوری اور واضح مقصد یہ رہا کہ وہ چند منتخب لوگوں کو آزاد کرائیں اور اُن سے تبلیغ آزادی کا کام لیں۔

۱۸۹۵ء کے موسم گرما میں متعدد مغربی مقلدوں نے اُن کی آواز پر لبیک کہا اور انھوں نے اُن میں سے بعض کو اپنے حلقۂ ارادت میں باقاعدہ داخل بھی کر لیا لیکن بعد میں وہ مختلف صلاحیتوں کے ثابت ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وویکانند کے پاس رام کرشن والی عقابی نگاہ نہ تھی جو دیکھتے ہی قطعی طور سے گذرتی ہوئی رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جاتی تھی اور اُن کے ماضی اور مستقبل سے نقاب ہٹا کر اُنھیں بالکل عریاں دیکھ لیتی تھی۔ وویکانند گیہوں اور بھوسی دونوں اپنے ساتھ جمع کرتے جاتے تھے اور اس کی اُمید کرتے تھے کہ مستقبل گیہوں کو باقی رکھے گا اور بھوسی کو ہوا میں اُڑا دے گا۔ ان میں سے انھوں نے چند نہایت وفادار شاگرد چن لئے، جن میں سسٹر کرسٹین کو چھوڑ کر سب سے قیمتی ذات نوجوان انگریز جے۔ جے گڈون کی تھی جنھوں نے اپنی پوری زندگی اُن کے لئے وقف کر دی۔ ۱۸۹۵ء کے آخر سے وہ اُن کے خود ساختہ سکریٹری بن گئے، گرو بھی اُنھیں اپنا داہنا ہاتھ سمجھتے تھے اور امریکہ میں جو بیج بویا گیا تھا اس کی حفاظت کے لئے ہم خاص طور سے اُنھیں کے ممنون رہیں گے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اُن کا سلسلۂ قیام انگلستان چلے جانے کی وجہ سے اگست سے دسمبر ۱۸۹۵ء تک کے لئے ٹوٹ گیا، اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔ وہ جاڑوں میں امریکہ واپس آئے اور پھر اپریل ۱۸۹۶ء تک مقیم رہے۔ انھوں نے اپنی ویدانتی تعلیمات لکچروں کے دو سلسلوں میں جاری رکھیں اور نیویارک میں کچھ نجی سبق بھی دیتے۔ پہلا سلسلہ دسمبر ۱۸۹۵ء

میں کرم یوگ (عمل کے ذریعہ حصولِ معرفت) پر تھا جس کی تشریحات اُن کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں اور دوسرا فروری ۱۸۹۶ء میں بھگتی یوگ (عشق و محبت کے راستہ) پر تھا۔

اُنھوں نے ہر جگہ تقریریں کیں اور ہر قسم کے لوگوں میں۔ نیویارک، بوسٹن اور ڈٹرائٹ میں بڑے بڑے مجموعوں کے سامنے، ہارٹفورڈ میں مابعد الطبیعاتی سوسائٹی کے سامنے، بروکلین میں اخلاقی سوسائٹی کے سامنے اور ہارورڈ میں فلسفہ کے طلبار اور اساتذہ کے سامنے۔ ہارورڈ میں اُنھیں مشرقی فلسفہ کی اور کولمبیا میں سنسکرت کی پروفیسری پیش کی گئی۔ نیویارک میں اُنھوں نے مسٹر فرانسس لیگٹ کی صدارت میں ویدانت سوسائٹی قائم کی جو بعد میں امریکہ کے اندر ویدانتی تحریک کا مرکز بن جانے والی تھی۔

اُن کا اصولِ عمل تھا رواداری اور مذہبی آفاقیت۔ نئی دنیا میں تین سال کی یاترا اور مغرب کے عقائد اور افکار سے مسلسل رابطہ نے اُن کے ذہن میں ایک عالمگیر مذہب کے آدرش کو اور پختہ کردیا تھا۔ لیکن اس کے عوض ان کی ہندو ذہنیت کو ایک دھکا بھی لگا تھا۔ اُنھوں نے ہندوستان کے تمام اہم مذہبی اور فلسفیانہ افکار میں ایک مکمل نئی تشکیل کی ضرورت محسوس کی اگر اُسے اپنی قوتِ تسخیر اور قوتِ ارتقا کو دوبارہ حاصل کرنا اور مغرب میں نفوذ کر کے اُسے زرخیز بنانا تھا۔ یہ خیال اُنھوں نے ۱۸۹۳ء ہی میں مدراس میں پیش کیا تھا۔ اس کے جنگل کی طرح بے ترتیب پھیلے ہوئے خیالات اور ایک دوسرے میں گتھی ہوئی شکلوں کو منظم کرنا ضروری تھا اور آفاقی رُوح کے لئے کئی مضبوط محوروں کے گرد ان کی گروہ بندی لازمی تھی۔ ہندوستان مابعد الطبیعات کے بظاہر متضاد تصوّرات (توحیدی ویدانت کی وحدت مطلق، "مشروط" وحدت اور ثنویت) جو اپنشدوں میں بھی ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے اس کے محتاج تھے کہ ان میں مطابقت پیدا کی جاتے اور ایک پُل بنایا جائے

جو قدیم ترین ہندوستانی فلسفہ کے عمیق ترین خیالات اور تسلیم شدہ جدید سائنسی اصولوں کے درمیان رابطوں کا ایک تقابلی گوشوارہ بنا کر اُن کو مغربی مابعد الطبیعات کے تصورات سے ملا دے۔ اس آفاقی صحیفہ کے تیار کرنے کی خود اُنھیں خواہش تھی اور وہ اپنے ہندوستانی شاگردوں سے مطالبہ کرتے تھے کہ وہ اس تشکیلِ نو کے لئے مواد کا انتخاب کرنے میں اُن کی مدد کریں۔ وہ اس پر زور دیتے تھے کہ یہ ہندو فلسفہ کو یوروپی زبانوں میں پیش کرنے کا مسئلہ ہے تاکہ "خشک فلسفہ، پیچیدہ دیومالا اور عجیب وغریب نفسیات کے اندر سے ایک ایسا مذہب تیار ہو جائے جو آسان، ہردلعزیز اور سہل الحصول بھی ہو اور اسی کے ساتھ بہترین دماغوں کے مطالبات کو آسودہ بھی کر سکے"۔

مذہب پرست ہندو اور یورپ کے علومِ ہند کے ماہر بڑی آسانی سے کہہ سکتے تھے اور انھوں نے یہ بات کہی بھی کہ اس طرح کی مہم میں یہ خطرہ بھی پوشیدہ ہے کہ مستند وضع کی بنی ہوئی قدیم قلمکار چھینٹ کے نقش ونگار تبدیل ہو جائیں گے۔ لیکن وویکانند نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس کے برعکس انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ جن خطوط کی حقیقت یعنی اصل رُوح کو جھوٹے نقش ونگار نے چھپا رکھا ہے وہ صاف ہو جائیں گے۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے کتنے مواقع پر کیا۔

اس کے علاوہ اُن کے سے ذہن رکھنے والے کے لئے مذہب چاہے کسی شکل میں بھی اس کا ظہور ہوا ہو، ہمیشہ کے لئے بعض الفاظ میں محدود اور متعین نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا ارتقا ہوتا رہتا ہے، اگر وہ ایک لمحہ کے لئے بھی رُک جائے تو یہ اس کی موت ہے۔ اُن کا آفاقی نصب العین ہمیشہ حرکت میں پوشیدہ تھا، اُسے مشرق اور مغرب کے متصل اتحاد سے زرخیز بناتے رہنا ضروری تھا اور اُن میں سے کوئی بھی کسی ایک عقیدے یا ایک مخصوص وقت میں گرفتار

نہیں تھا بلکہ دونوں زندہ تھے اور بڑھ رہے تھے۔ ویدانت سوسائٹی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ خیالات اور اشخاص کے مسلسل تبادلہ پر نظر رکھے تاکہ افکار و تصوّرات کا خون برابر گردش میں رہے اور سارے عالمِ انسانی کو اس میں شور بور رکھے۔

ہندوستان اور یورپ کا مِلاپ

نیویارک کے روشن اور خشک آسمان کے نیچے، وہاں کے برق وش ماحول میں وویکانند کا ذہن عمل کے لئے ایک مشعل کی طرح جلتا تھا اور اس دنیا کی مجنونانہ عمل پسندی کے درمیان انھیں بھی جلائے دے رہا تھا۔ سوچنے، لکھنے اور پُرجوش تقریریں کرنے میں اُن کی قوت کا صرف اُن کی صحت کے لئے خطرناک بنتا جا رہا تھا۔ جن مجمعوں میں وہ اپنی تابناک رُوح پھُونک دیتے تھے انھیں سے باہر آکر وہ صرف ایک علاحدہ گوشہ چاہتے تھے جہاں "لیٹ کر مر جائیں۔" اُن کی مختصر زندگی جو پہلے ہی بیماری کی نذر ہو چکی تھی، ایسے حد سے زیادہ تھکا دینے والے کاموں کی تکلیف سے اور مختصر ہو گئی تھی۔ اس سے وہ کبھی سنبھل نہ سکے اور تقریباً اُسی زمانے میں انھیں اپنی موت قریب آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ درحقیقت انھوں نے یہاں تک کہا: "میرے دن پورے ہو گئے۔" لیکن جو زبردست کھیل وہ کھیل رہے تھے اور جو ہمّت آزما کام وہ کر رہے تھے وہ ہمیشہ انھیں اس سے باہر کھینچ لاتے تھے۔

خیال تھا کہ یورپ کے سفر سے اُن کا ذہن ادھر سے ہٹ جائے گا لیکن وہ جہاں کہیں بھی جاتے تھے ہمیشہ اپنی قوّت صرف کرتے رہتے تھے۔ انگلستان میں اُنھوں نے تین بار

قیام کیا۔ستمبر سے آخر نومبر ۱۸۹۵ء تک، اپریل سے آخر جولائی ۱۸۹۶ء تک اور اکتوبر سے ۱۶ دسمبر ۱۸۹۶ء تک۔

یہاں انھوں نے جو تاثر قبول کیا وہ خلافِ اُمّید اُس سے گہرا تھا جو امریکہ سے قبول کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ امریکہ سے انھیں کوئی شکایت نہ تھی کیونکہ جس قسم کی مخالفتوں سے انھیں سابقہ پڑا تھا اور جس قسم کے مایا جال سے خود کو محفوظ رکھنے پر وہ مجبور تھے، ان کے باوجود وہاں انھیں بڑی لطیف ہمدردیاں اور بڑے وفادار ساتھی ملے تھے اور ایک ایسی غیر مزروعہ زمین ملی تھی جو بوئے جانے کے لئے ترس رہی تھی۔

لیکن جب انھوں نے اس پُرانی دنیا (یورپ) میں قدم رکھا تھا انھیں عقلیت کا ایک دوسرا ماحول ملا تھا۔ یہاں اب ایک نئی قوم کے وہ اوچھے اور وحشیانہ حوصلے نظر نہیں آتے تھے جو اپنی قوتِ ارادی کا ضرورت سے زیادہ اندازہ لگاتی تھی اور اسی لئے راج لوگ پر ٹوٹ پڑی تھی تاکہ غلط طریقہ سے استعمال کر کے ہی سہی، اُس سے ساری دنیا کو مسخر کر لینے کا طفلانہ اور غیر صحت مند مطالبہ کرے۔ یہاں ہزاروں سال کا فکری سرمایہ اُن ہندوستانی تعلیمات کی طرف براہِ راست ہاتھ بڑھا رہا تھا جو وحدانیت پسند (اَدوَیتی) ویویکانند کے نقطۂ نظر سے بھی اہم تھا اور وہ حصولِ علم یا گیان یوگ کے تعلیمی طریقے تھے۔ اس لئے یورپ کے سامنے اُسے پیش کرتے وقت وہ ابتدائی نصاب کے بعد سے شروع کر سکتے تھے کیونکہ یورپ میں صحت اور سائنسی نظر سے پرکھنے کی صلاحیت تھی۔

اگرچہ ویویکانند امریکہ میں بعض اعلیٰ پایہ کے دانشوروں سے ملے تھے جیسے پروفیسر رائٹ، فلسفی ولیم جیمس، ماہر برقیات نکولاس ٹسلا جنھوں نے اُن کے کام میں دلچسپی ظاہر کی تھی، لیکن یہ لوگ ہندو مابعد الطبیعاتی خیالات کے میدان میں ابھی بالکل نئے تھے اور انھیں شروع سے ہارورڈ یونیورسٹی

کے گریجویٹوں کی طرح سب کچھ سیکھنا تھا۔

یورپ میں وویکانند کو اپنا مقابلہ میکس مُلر اور پال ڈیوسن جیسے ہندوستانیت کے ماہروں سے کرنا تھا مغرب کے فلسفیانہ اور لسانیاتی علوم کی عظمت اپنی متحمل صلاحیت اور بے لوث دیانت کے ساتھ یہیں اُن پر منکشف ہوئی۔ اس نے اُن کے دل کی گہرائیوں کو چھوا انھیں اس کی محبت اور احترام کا ایک ایسا دلپذیر شاہد بنا دیا جتنا کوئی بھی ہندوستان کے لئے نہیں ہوا تھا کیونکہ ابھی تک کوئی اس سے واقف نہ تھا اور اس وقت تک وہ خود بھی انھیں (ناواقفوں) میں شامل تھے۔

لیکن انگلستان کی اس دریافت نے ان کے اندر ایک بالکل مختلف قسم کے جذبہ کا نقش اُبھارا تھا۔ وہ ایک دشمن کے روپ میں آئے تھے لیکن مفتوح ہو گئے۔ ہندوستان کی واپسی پر اُنھوں نے اس کا اعلان بڑی اعلیٰ قسم کی وفاداری سے کیا: "انگلستان کی سرزمین پر اس سے پہلے کسی ایسے شخص نے قدم نہ رکھا ہوگا جس کے دل میں ایسی نفرت رہی ہو جتنی میرے دل میں انگریزوں کے لئے تھی ...... لیکن اب تمھارے درمیان کوئی ایسا نہ ہوگا جو مجھ سے زیادہ انگریز قوم سے محبت رکھتا ہو......"

انگلستان سے اپنے ایک امریکی شاگرد کو خط (۸ اکتوبر ۱۸۹۶ء) میں لکھا: "انگریزوں کے متعلق میرے خیالات میں انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔"

"انھیں ایک قوم ملی جو "بہادروں کی قوم ہے، اصل چھتری ...... بہادر اور ثابت قدم ...... انھیں یہ تعلیم ملی ہے کہ وہ اپنے جذبات کو کسی پر ظاہر نہ کریں بلکہ چھپائیں لیکن اس اوپری خول کے اندر انگریزی دل میں جذبات کا ایک گہرا سرچشمہ ہے۔ اگر تمھیں ایک بار یہ معلوم ہو جائے کہ وہاں کیسے پہنچا جاتے تو وہ ہمیشہ کے لئے تمھارا دوست بن جائے گا۔ اگر اُن کے

دماغ میں کوئی خیال ڈال دیا جاتا ہے تو وہ پھر کبھی نہیں نکلتا بلکہ اُن کی زبردست نسلی عمل پسندی اور قوّت اس میں کونپلیں پھوڑ دیتی ہے اور بہت جلد اُن میں پھل لگ جاتے ہیں ...... انھوں نے یہ راز پالیا ہے کہ بغیر غلامانہ لجاجت کے اطاعت کس طرح کی جائے اور مکمّل پابندیٔ قانون کے ساتھ مکمل آزادی کس طرح حاصل کی جائے۔"

یہ قوم قابلِ رشک ہے! وہ جن پر ظلم کرتی ہے انھیں بھی اپنی عزّت کرنے پر مجبور کر دیتی ہے وہ حضرات بھی جو اپنی محکوم قوم کے سشط ریز ضمیر کہے جا سکتے ہیں، جیسے راجہ رام موہن رائے، وویکانند، ٹیگور اور گاندھی وہ بھی اس فاتح کی عظمت اور شاید اُس کے ساتھ ایک دوستانہ اشتراک کی افادیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اگر انھیں کبھی اپنے حاکموں کو تبدیل کرنا پڑا تو وہ یقیناً کسی اور کا انتخاب نہیں کریں گے۔ اپنے اقتدار کی وحشیانہ بداعمالیوں کے باوجود سارے مغرب میں (اور میں اس میں پورے یورپ اور امریکہ کو شامل کرتا ہوں) صرف یہی ایک قوم نظر آتی ہے جو ہندوستانی تصوّرات کی آزادانہ ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ موقع دے سکتی ہے۔

لیکن انگریز قوم کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے کبھی اپنے ہندوستانی نصب العین کو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ وہ ہندوستان کے رُوحانی اقتدار کو سنوارنے کے لئے انگلستان کی عظمت کو کام میں لانا چاہتے تھے۔ انھوں نے لکھا: "اپنی بہت سی خامیوں کے باوجود برطانوی حکومت ہی خیالات کی اشاعت کے لئے سب سے بڑی مشین ہے۔ میں اپنے خیالات کو اس مشین کے بیچ میں ڈال دوں گا اور وہ ساری دنیا میں پھیل جائیں گے ...... روحانی تصوّرات ہمیشہ نیچے دبے ہوئے لوگوں ہی سے ملتے ہیں (یہودی اور یونانی)"

لندن کے پہلے ہی سفر میں انھوں نے اپنے ایک شاگرد کو مدراس میں لکھا: "انگلستان

ہیں میرا کام نہایت شاندار رہے !"

ووِیکانند کی کامیابی فوری تھی۔ پریس نے اُن کی بڑی تعریفیں کیں۔ اُن کی اخلاقی حیثیت کا مقابلہ اعلیٰ ترین مذہبی شخصیتوں سے کیا گیا؛ اُن کے صرف ہندوستان کے پیشرووں رام موہن رائے اور کیشب ہی سے نہیں بلکہ گوتم بدھ اور مسیح سے بھی۔ امیروں کے حلقے میں اُن کا اچھا استقبال ہوا۔ یہاں تک کہ کلیسا کے سربراہوں نے بھی اُن سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

اپنے دوسرے دورے میں انھوں نے ویدانتی تعلیم کے باقاعدہ سبق شروع کرنے اور چونکہ وہاں ذہین عوام کے ملنے کا زیادہ بھروسہ تھا اس لئے انھوں نے دماغی یوگ یعنی گیان یوگ سے ابتدا کی۔ اِن کے علاوہ انھوں نے پکیڈلی پکچر گیلری اور پرنسس ہال میں، کلبوں اور تعلیمی اداروں میں، اینی بسنٹ لاج اور پرائیویٹ انجمنوں میں لکچر دیئے۔ امریکی سامعین کی سطحی دلچسپی کے مقابلہ میں انھوں نے انگریز سننے والوں کی سنجیدگی کو زیادہ محسوس کیا۔ انگریز جو امریکیوں کے مقابلہ میں کم تیز وطرار اور زیادہ قدامت پسند تھے شروع میں بہت رُک رُک کر اُن کی طرف آئے لیکن جب آئے تو بے دلی سے نہیں آئے۔ ووِیکانند (اُن کے درمیان) زیادہ بے تکلفی محسوس کرتے اور اُن پر زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ اُن سے اُنھوں نے اپنے محبوب رام کرشن کی باتیں کیں، جنھیں وہ ہمیشہ دنیا کی آلودہ نگاہوں سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے پُرجوش انکسار سے کہا، "مجھ میں جو کچھ بھی ہے سب کا ایک ہی ماخذ ہے۔ ...... میرے پاس ذرّہ برابر بھی اپنا کچھ نہیں ہے جسے پیش کرسکوں ......" اُنھوں نے اُن کے متعلق یہ اعلان کیا کہ وہ "کرۂ ارض کی موجودہ مذہبی زندگی کا منبع" ہیں۔

رام کرشن ہی نے اُنھیں میکس مُلر سے متعارف کیا تھا۔ اس قدیم ماہر ہندوستانیت نے، جس کا عزم جوان ہندو مذہب کی روح کی ہر دھڑکن کو ایک تازہ تحیّر سے دیکھتا تھا، قدیم

کاہنوں کی طرح مشرق کے اس اُبھرتے ہوئے ستارے رام کرشن کو پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ وہ اس بات کے لئے بے چین تھے کہ اس نئے اوتار کے عینی شاہد سے کچھ دریافت کریں اُنھیں کی درخواست پر وویکانند نے اپنے گرُو کے متعلق اپنی یادداشتیں مرتّب کیں جن سے میکس مُلر نے رام کرشن پر اپنی مختصر سی تصنیف میں کام لیا۔ وویکانند نے آکسفرڈ کے اس جادُوگر (میگس) کی طرف بھی کشش محسوس کی، جس نے اپنی رصدگاہ سے بنگال کے آسمان میں اس عظیم الشان ہنس (پرم ہنس) کے گذرنے کا اعلان کیا تھا۔ ۲۸ مئی ۱۸۹۶ئہ کو انھیں ان کے گھر بھی مدعو کیا گیا اور ہندوستان کا یہ نوجوان سنیاسی یورپ کے اس بوڑھے عالم کے سامنے جُھک گیا، وویکانند نے اپنی ہی قوم کے ایک بزرگ کی حیثیت سے اُن کا استقبال کیا، انھیں ایک قدیم العہد رشی کا اوتار بتایا، ویدک ہندوستان کے قدیم زمانے میں ان کی پہلی پیدائش اُنھیں یاد دلائی اور کہا کہ "یہ ایک ایسی رُوح ہے جو ہر روز برھما سے اپنی رُوح کو متحد کرتی جارہی ہے ......"

* * * * * *

انگلستان نے انھیں غالباً زندگی کی حسین ترین رفاقتوں کی شکل میں اس سے بھی زیادہ دیا، (یہ رفیق تھے): جے جے گڈوِن، مارگریٹ نوبل، مسٹر اور مسز سیویئر۔

اِن میں سب سے پہلے کا ذکر میں اس سے قبل ہی کرچکا ہوں، اُن سے اُن کی ملاقات نیویارک میں ۱۸۹۵ئہ کے آخر میں ہوئی تھی۔ سوامی کے اسباق لکھنے کے لئے ایک اچھے مختصر نویس کی ضرورت تھی، اور ایک ایسے شخص کا پانا مشکل تھا جو اچھا خاصا تعلیم یافتہ بھی ہو۔ انگلستان سے آتے ہی نوجوان گڈوِن کو اس کام کے لئے رکھا لیا گیا، پندرہ دن کے لئے وہ امتحاناً رکھے گئے تھے لیکن ابھی یہ مدّت ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ جن خیالات کو وہ لکھ رہے تھے اُن سے متاثر ہوکر انھوں نے سب کچھ چھوڑ دیا اور اپنے کو گرُو کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ انھوں نے

اُجرت لینے سے انکار کر دیا، دن رات محنت کرتے تھے اور وویکانند جہاں کہیں جاتے اُن کے ساتھ رہتے اور بڑی محبت سے اُن کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انھوں نے برہمچاری رہنے کا عہد کر لیا اور صحیح معنوں میں گرو کے لئے اپنی جان نذر کر دی۔ ہندوستان میں قبل از وقت اُن کا انتقال ہو گیا جہاں وہ اس کے ساتھ چلے گئے تھے جو اُن کا خاندان تھا، وطن تھا اور جس کے عقیدے سے وہ پُرجوش طور پر وابستہ ہو گئے تھے۔

مارگریٹ نوبل نے بھی اس سے کمتر درجہ پر اپنی قربانی نہیں دی۔ مستقبل ہمیشہ اُن کے اختیار کردہ نام سسٹر نویدیتا کو اُن کے محبوب گرو کے نام سے وابستہ رکھے گا جیسے سینٹ کلیرا اور سینٹ فرانسس ..... (حالانکہ سچ یہ ہے کہ شاہانہ مزاج سوامی اس غریب معمولی انسان یعنی سینٹ فرانسس سے بالکل مختلف تھے اور جو لوگ اُن کے ہو جاتے تھے اُن کو قبول کرنے سے پہلے وہ اُن کو بڑی گہری آزمائشوں میں مبتلا کرتے تھے) وہ لندن کے ایک اسکول کی نوجوان ہیڈ مسٹریس تھیں ..... وویکانند نے اُن کے اسکول میں تقریر کی اور وہ اُسی وقت اُن کے جادو کا شکار ہو گئیں۔ لیکن بہت دنوں تک وہ اس کے خلاف جدّوجہد کرتی رہیں۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھیں جو وویکانند کے ہر لکچر کے بعد اُن کے پاس آتی تھیں اور کہتی تھیں: "سوامی جی! آپ ٹھیک کہتے ہیں. ..... لیکن ......"

وہ ہمیشہ بحث کرتی اور مقابلہ کرتی رہتی تھیں۔ وہ انگلستان کی اُن ہستیوں میں سے تھیں جن پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے لیکن ایک دفعہ جب ان پر فتح حاصل ہو جاتی ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے وفادار بن جاتی ہیں ..... وویکانند نے خود ہی کہا تھا "اس سے زیادہ قابلِ اعتماد ہستیاں نہیں ہیں۔"

جس وقت انھوں نے یہ طے کیا کہ وہ اپنی قسمت سوامی وویکانند کے ہاتھ میں دے دیں گی

اُس وقت اُن کی عمر اٹھائیس سال کی تھی۔ انھوں نے اُن کو ہندوستان آنے اور خود کو ہندو عورتوں کی تعلیم کے لئے وقف کر دینے پر آمادہ کیا۔ انھوں نے ان کو ہندو بننے، "اپنے خیالات، تصوّرات، عادات ہر چیز کو ہندو بنا لینے اور اپنی پُرانی یادوں کو یکسر بُھلا دینے" پر بھی مجبور کیا۔ سسٹر نویدیتا نے کنواری رہنے کا عہد کر لیا۔ وہ پہلی مغربی خاتون تھیں جو ہندوستانی راہبانہ نظام میں داخل کی گئیں۔ ہم آگے پھر انھیں وویکانند کے ساتھ دیکھیں گے، انھیں نے اُن کی بات چیت محفوظ کر لی ہے اور اُن کی شخصیت کو مغرب میں ہر دلعزیز بنانے کی سب سے زیادہ جدّوجہد کی ہے۔

سیویئر میاں بیوی کی دوستی بھی اس قسم کی محبّت اور مکمل اعتماد کے نقوش سے مالا مال ہے جو ایک دفعہ شروع ہو کر ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ مسٹر سیویئر ایک اُنچاس سال کے ریٹائرڈ کپتان تھے لیکن اُنھیں اور ان کی بیوی دونوں کو مذہبی مسائل سے گہرا شغف تھا اور وہ سوامی وویکانند کی شخصیت، خیالات اور الفاظ سے بے حد متاثر ہوئے۔ مجھ سے مس میک لیوڈ نے بتایا کہ "ایک لکچر سے باہر آکر مسٹر سیویئر نے مجھ سے پوچھا 'تم اس نوجوان سادھو کو جانتی ہو کیا یہ جیسا دکھائی دیتا ہے ویسا ہی ہے'؟ میں نے کہا 'ہاں' انھوں نے کہا 'پھر اس صورت میں تو اُن کی پیروی کرنا اور انھیں کی ہمراہی میں خدا کو حاصل کرنا چاہئے' وہ گئے اور اپنی بیوی سے کہا 'تم مجھے اس کی اجازت دیتی ہو کہ میں اس سوامی کا شاگرد ہو جاؤں؟' اُنھوں نے جواب دیا 'ہاں ضرور!' پھر خود بیوی نے پوچھا 'کیا تم مجھے سوامی کی شاگرد بننے کی اجازت دو گے'؟ انھوں نے ایک طرح کی محبّت آمیز خندہ دلی کے ساتھ جواب دیا 'میں نہیں جانتا......'"

یہ لوگ بھی اُن کے ساتھی بن گئے اور اپنی چھوٹی چھوٹی آمدنیوں سے دست بردار ہو گئے لیکن وویکانند خود اُس سے زیادہ اُن دوستوں کے مستقبل کے متعلق پریشان تھے

اور اس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنا سب کچھ اس کام میں دے دیں بلکہ انھوں نے انھیں اس پر مجبور کیا کہ کچھ اپنے لئے بھی رکھیں۔ وہ سوامی کو اپنے بچّے کی طرح سمجھتے تھے اور جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے، اُس ادویت آشرم کی بنیاد ڈالنے میں لگ گئے، ہمالیہ میں جس کے بنانے کا خواب وویکانند دیکھا کرتے تھے تاکہ وہاں بیٹھ کر غیر شخصی خدا کے بارے میں مراقبہ کر سکیں۔ اُن کو وویکانند کے خیالات میں سے اس توحیدی ویدانتیت نے اپنی طرف کھینچا تھا اور یہی اُن کے لئے اہم بات تھی۔ جو آشرم انھوں نے بنایا تھا سنہ ۱۹۱۵ء میں اسی میں مسٹر سیویئر کا انتقال ہو گیا، مسز سیویئر اُن کے اور سوامی وویکانند کے بعد بھی زندہ رہیں۔ وہ تنہا یوروپین خاتون تھیں جو پندرہ سال تک پہاڑوں کے درمیان اس دور دراز مقام پر جہاں سال کے کئی مہینے پہنچنا ناممکن تھا قیام پذیر رہیں اور اپنا سارا وقت بچّوں کی تعلیم میں لگاتی رہیں۔

مس میک لیوڈ نے اُن سے پوچھا: "آپ یہاں گھبرا نہیں جاتیں؟" انھوں نے سادگی سے جواب دیا: "میں اُن (سوامی وویکانند) کے متعلق سوچا کرتی ہوں۔"

ہندوستانیوں میں سے صرف وویکانند ہی کو ایسے قابلِ قدر رفیق نہیں ملے ہیں بعض بڑی ہندو شخصیتوں کو انگریزوں میں بڑے دلیر اور وفادار دوست اور مددگار ہاتھ آتے رہے ہیں۔ ٹیگور کے لئے پیرسن اور گاندھی کے لئے میر ابن یا اینڈریوز کیا تھے یہ سب کو معلوم ہے! کچھ دن گذرنے کے بعد جب آزاد ہندوستان اس کا جائزہ لے گا کہ اُسے برطانوی حکومت سے کیا اذیتیں ملیں اور کیا فوائد حاصل ہوئے تو دوسری چیزوں کے مقابلے میں یہ پاک دوستیاں زیادتیوں سے بوجھل ہونے کے باوجود ترازو کے پلڑے کو ٹھہرا دیں گی۔

لیکن اس ملک میں جہاں اُن کے خیالات نے زبردست ہیجان پیدا کیا تھا۔ انھوں نے

کسی ایسی چیز کی بنا ڈالنے کی کوشش نہیں کی جیسی ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کی تھی جہاں رام کرشن مشن ترقی کر رہا اور پھیل رہا تھا۔ جیسا کہ اُن کے ایک امریکی شاگرد نے مجھ سے کہا کہ انھیں یورپ اور انگلستان کی اعلیٰ ذہانت کا خیال تھا اور اس کے لئے انھیں رُوحانی حیثیت سے بلند ہمت مبلغوں کی تلاش تھی، جو اُن کے بارنا گور کے ساتھیوں میں کمیاب تھے، کیا یہ بات یقین کرنے کی ہے؟ لیکن اس زبردست تھکن کا ضرور خیال رکھنا ہوگا جو کبھی کبھی اُن پر طاری ہو جاتی تھی۔ وہ دنیا سے اور کاموں کی پابندیوں سے اُکتا گئے تھے، انھیں آرام کی خواہش تھی۔ جو بیماری گھُن کی طرح اُن کے جسم کی دیواروں کو کھاتے جا رہی تھی وہ طویل مدتوں کے لئے انھیں زندگی سے دُور کر دیتی تھی۔ ایسے وقتوں میں اس کا اعلان کر کے کہ وہ کسی چیز کے بانی نہیں ہیں، کوئی نئی چیز بنانے سے قطعاً انکار کر دیتے تھے۔ ۲۳ اگست ۱۸۹۶ء کو انھوں نے لکھا: "میں نے کام شروع کر دیا ہے، اُسے دوسروں کو پورا کرنا چاہئے! تم نے دیکھا ہوگا کہ کام کو جاری رکھنے کے لئے میں نے کچھ وقت کے لئے روپیہ پیسہ اور املاک سے دلچسپی لی۔ اب مجھے یقین ہے کہ میرا کام ختم ہو چکا، اب مجھے ویدانت میں یا کسی فلسفہ اور کسی کام میں کوئی دلچسپی باقی نہیں ہے۔۔۔۔۔ اس کی مذہبی افادیت بھی مجھے بے کیف بنا رہی ہے۔۔۔۔۔ میں یہاں سے جانے کی تیاری کر رہا ہوں اور اس دنیا میں، اس جہنم میں کبھی واپس نہیں آؤں گا۔"

اس دلدوز چیخ کی تلخی کو وہ تمام لوگ محسوس کریں گے جو اس بیماری سے پیدا ہونے والے زبردست ضعف سے واقف ہیں جو انھیں گھُلائے جا رہی تھی! اس کے برعکس کسی کسی وقت یہ اعلیٰ قسم کی رفیع الخیالی میں ظاہر ہوتی تھی۔ ساری کائنات انھیں تعلق سے خالی ایک طفل مزاج خدا کا تیزی سے گھومتا ہوا کھلونا نظر آتی تھی۔ لیکن بے تعلقی دونوں میں

رہتی تھی، وہ خوشی ہو یا غم۔ دُنیا انھیں چھوڑ رہی تھی اور پتنگ کی ڈور ٹوٹنے والی تھی۔

* * * * * *

ہمدرد دوست جو اُن کی دیکھ بھال کرتے تھے، اُنھیں آرام کے لئے پھر سوئٹزرلینڈ لے گئے۔ ۱۸۹۶ء کے موسم گرما کا بڑا حصّہ انھوں نے وہیں گذارا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان برفیلی، طوفانی اور پہاڑی ہواؤں کے لطف سے جو اُنھیں ہمالیہ کی یاد دلاتی تھیں، فائدہ بھی اُٹھایا۔ وہیں ماں بلاں اور لٹل سینٹ برنارڈ کے درمیان کوہستانِ الپس کے ایک گاؤں میں اُنھیں پہلی دفعہ ہمالیہ میں ایک ایسا آشرم قائم کرنے کا خیال آیا جہاں اُن کے مشرقی اور مغربی شاگرد یکجا ہوں۔ اور سیویئر میاں بیوی نے جو وہاں اُن کے ساتھ تھے، اِس خیال کو کبھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا بلکہ یہی اُن کی زندگی کا کارنامہ بنا۔

اس پہاڑی آرام گاہ میں اُنھیں پروفیسر پال ڈیوسن کا خط ملا جس میں اُنھیں کیل (جرمنی) آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اُن سے ملنے کے خیال سے انھوں نے سوئٹزرلینڈ میں اپنا قیام مختصر کر دیا اور طالبعلموں کا راستہ اختیار کرتے ہائیڈل برگ، کوبلینز، کولون اور برلن ہوتے ہوئے روانہ ہوئے کیونکہ وہ جرمنی کی بھی ایک جھلک دیکھ لینا چاہتے تھے۔ اُن کی مادّی طاقت اور عظیم الشان تہذیب و تمدّن کا اُن پر گہرا اثر ہوا۔ میں اس سے پہلے شوپن ہائر گیسل شیفٹ کے سالنامہ میں اُن کے شوپن ہائر سوسائٹی کے بانی سے ملنے اور کیل جانے کا تذکرہ کر چکا ہوں۔ وہاں اُن کا استقبال نہایت محبّت آمیز ہوا اور اُن کے تعلّقات اتنے پُرجوش رہے جس کی امید پال ڈیوسن جیسے پکّے ویدانتی سے کی جا سکتی تھی جنھیں ویدانت صرف "حقیقت کی جستجو کرنے والے انسانی ذہن کی شاندار تشکیل اور بیش بہا تخلیق" ہی نظر نہیں آتے تھے "بلکہ خالص اخلاقی زندگی کے سب سے زبردست مؤیّد اور

مرگ و ذلیست کے کرب میں تسکین کے سب سے بڑے "سہارے" معلوم ہوتے تھے۔

اگرچہ ڈیوسن سوامی وویکانند کی ذاتی دلکشی، روحانی قوت اور گہرے علم کا احساس رکھتے تھے لیکن ڈائری میں اُن کے اندراجات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس نوجوان جہان کے شاندار مستقبل کو کبھی انھوں نے دیکھ لیا تھا۔ خاص طور سے وہ یہ سوچنے سے بالکل تمام تھے کہ اس شخص کے دل کی گہرائی میں کتنا زبردست المناک خلوص ہے، جو دیکھنے میں بیحد قوی اور خوش مزاج تھا لیکن جس کا دل اپنی مفلوک الحال قوم کے لئے گھٹ رہا تھا اور جس کے جسم کو موت نے بالکل برباد کر دیا تھا۔ اُنھوں نے اُن کو تفریح اور شکر گذاری کے آزاد لہجے میں دیکھا جب وہ اس زبردست جرمنی عالم اور دانشمند کے سامنے خوش و خرم تھے جس نے ہندوستان کے مفاد کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ شکر گذاری کے یہ نقش وویکانند کے ذہن میں کبھی دھندلے نہیں ہوئے اور انھوں نے ہمیشہ کیل کے دورِ قیام کی روشن یاد ہی کو نہیں بلکہ جن دنوں ڈیوسن ہیمبرگ، ایمسٹرڈم اور لندن میں اُن کے ساتھ رہے انھیں بھی تازہ رکھا۔ اُن کے خیالات برمھ وادن کے ایک بلند پایہ مضمون میں محفوظ ہیں جن میں وویکانند نے اپنے شاگردوں کو اُن یورپیوں کے احسانات یاد دلائے ہیں جو خود ہندوستانیوں سے بڑھ کر یہ جانتے تھے کہ ہندوستان کو کس طرح سمجھیں اور اس سے کیونکر محبت کریں۔ اس میں خاص حیثیت دو عظیم ترین شخصیتوں میکس مُلر اور پال ڈیوسن کو حاصل تھی۔

اُنھوں نے دو مہینے انگلستان میں اور گذارے اور اس دوران میں میکس مُلر، ایڈورڈ کارپنٹر، فریڈرک مائرس اور ولبر فورس سے ملاقاتیں کیں اور ویدانت کے ہندو نظریہ اور ادویت پر تقریروں کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن اب یورپ میں اُن کے قیام کا زمانہ

ختم ہونے کے قریب تھا۔ ہندوستان کی آوازیں انھیں کھینچ رہی تھی۔ وطن کی یاد نے اُن پر حملہ کر دیا اور وہی تھکا ہوا انسان جو ابھی تین ہفتے پہلے نئی پابندیاں قبول کرنے پر مایوسانہ غصّے سے انکار اور اس کا اعلان کرتا تھا کہ وہ زندگی اور عمل کی جہنمی چکّی سے دُور بھاگنے کا خواہشمند ہے، نہ صرف پورے جوش و خروش سے اس میں کود پڑا اور پھر اپنے ہی ہاتھوں سے خود کو اس چکّی میں جوت دیا کیونکہ رخصت ہوتے وقت جیسا کہ انھوں نے اپنے انگریز دوستوں سے کہا: "ممکن ہے میں اس جسم کو چھوڑ دینے کو بہتر سمجھوں اور اسے ایک بیکار لباس کی طرح اتار پھینکوں لیکن میں ...... انسان کی خدمت کرنا کبھی نہیں چھوڑوں گا ......"

کام کرنا، اس زندگی میں اور آنے والی زندگیوں میں خدمت کرنا، پھر پیدا ہونا اور بار بار جنم لینا اور پھر خدمت کرنا ...... ووِیکانند اس "جنم میں واپسی" پر مجبور تھے۔ اُن کی تقدیر، اُن کی زندگی کی علتِ غائی محض واپس آنا تھا، بغیر آرام کئے واپس آنا تاکہ "اس جہنم" کے شعلوں سے لڑا اور اس کے شکار ہونے والوں کو بچایا جا سکے۔ اُن کی تقدیر ہی جلنا تھی تاکہ دوسروں کو بچا سکیں۔

اُنھوں نے انگلستان ۱۶ دسمبر ۱۸۹۶ء کو چھوڑا اور ڈوور، کیلے، مال سینس ہوتے ہوئے اُنھوں نے اپنے یورپ کے قیام کو اٹلی کے ایک مختصر سے سفر سے مکمّل کیا۔ وہ ڈاونچی کی تصویر "آخری دعوت" کی زیارت کرنے ملان گئے، روم سے خاص طور سے متاثر ہوئے جو اُن کے خیال میں دہلی کے مقابلہ کی جگہ تھی۔ ہر لمحہ وہ اس کی شان کو نظر میں رکھتے ہوئے کیتھلک عبادات اور ہندو طریق پرستش کی یکسانیت محسوس کرتے اور جو انگریز اُن کے ساتھ تھے اُن کے سامنے اس کے علامتی حسن اور جذباتی دلکشی کی حمایت کرتے۔ وہ ابتدائی عیسائیوں اور زمین دوز مقبروں میں دفن شہیدوں کی یاد سے

بیحد متاثر ہوئے اور اطالوی جس طرح مسیح کی بچپن کی تصویر اور کنواری ماں کا لطیف احترام کرتے تھے اس میں شریک ہوتے۔ وہ کبھی اُن کے ذہن سے محو نہیں ہوئے جیسا کہ اُن کے اِن الفاظ میں دیکھا جا سکتا ہے جنھیں میں نے ہندوستان اور امریکہ کے سلسلے میں نقل کیا ہے۔ جب وہ سوئٹزر لینڈ میں تھے ایک دن پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹے سے گرجا گھر میں گئے، کچھ پھول توڑ کر اُنھوں نے مسٹر سیویر کو کنواری مریم کے قدموں پر چڑھانے کے لئے یہ کہہ کر دئے: "یہ بھی ماتا ہیں۔"

بعد میں ایک بار اُن کے شاگرد کو یہ انوکھی بات سوجھی کہ انھیں رفائیل کی بنائی ہوئی مریم عذرا کی ایک مورتی دے کر اُن سے برکت دینے کی خواہش کرے لیکن انھوں نے نہایت انکسار سے اس بات سے انکار کر دیا اور بچہ مسیح کے پاؤں بڑے تقدس سے چھو کر کہا: "میں تو اِن کے پاؤں آنسوؤں سے نہیں اپنے دل کے خون دھونا چاہتا ہوں۔"

یہ بات پوری سچائی کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اُن سے زیادہ کوئی دوسرا شخص مسیح سے زیادہ قرب نہیں رکھتا تھا اور اُن سے زیادہ اِس حقیقت کو محسوس نہیں کرتا تھا کہ خدا اور انسان کے درمیان یہ شفیع (مسیح) مغرب اور مشرق کے درمیان بھی شفیع بنایا جا سکتا ہے کیونکہ مشرق اُنھیں اپنا ہی سمجھتا ہے، وہ وہیں سے ہمارے پاس آئے تھے۔

جہاز پر جو انھیں یورپ سے ہندوستان لئے جا رہا تھا، ویکانند دیر دیر تک اُن دونوں دنیاؤں کے اتحاد کے اِس خارِجی رشتہ کے متعلق غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ صرف یہی ایک رابطہ نہ تھا، وہ زبردست رشتہ بھی تھا جسے بڑے بڑے غیر جانبدار

اہلِ قلم نے اس تاریک راستے پر چل کر بغیر کسی مدد اور رہنمائی کے دریافت کیا تھا، جو ہندوستان کے قدیم علوم اور خالص ہندوستانی رُوح کی طرف لے جاتا تھا۔ یہاں رُوحانیت کا وہ غیر متوقع شعلہ تھا جو پرانی اور نئی دونوں دُنیاؤں کے نیک خیال لوگوں کے دلوں میں سوامی کی باتیں سُننے کے ساتھ ہی بھڑک اُٹھا، فیاضانہ اعتماد اور وسعتِ قلب کے سُوتے پھُوٹ پڑے جن کا اظہار اُن پاک اور صاف دل روحوں نے کیا جنھوں نے خود کو اُن کے سپرد کر دیا تھا (کیا وہ اب نئے مغرب کے متعلق جس نے ساری دُنیا پر قبضہ کر رکھا ہے، یا زرہ بکتر سے آراستہ عقل کی تلوار اور طاقت کا پنجۂ فولادی دیکھ کر بھی یہی سوچتے!) اُن کے ساتھ شریف دوست تھے محبّت کے بندے جنھیں وہ ساتھ لئے جا رہے تھے (ان میں دو، سیویر میاں بیوی تھے جو اس جہاز میں اُن کے ہمراہ تھے، وہ یورپ کو اور اپنے پورے ماضی کو چھوڑ کر اُن کے ساتھ ہو لئے تھے۔)

اور جب انھوں نے اپنی چار سالہ یاترا کے حاصل کا جائزہ لیا یعنی جو خزانے وہ اپنے اہلِ وطن کے لئے لے جا رہے تھے، جن میں رُوحانی دولت اور رُوح کے گنجینے شامل تھے، تو یہ انھیں ہندوستان کے مفاد کے لئے کسی طرح کم نہ معلوم ہوئے۔ لیکن کیا ہندوستان کی تکالیف کو دُور کرنا اس سے زیادہ فوری اور ضروری نہ تھا؟ جو فوری امداد حاصل کرنے کے لئے وہ گئے تھے، مغرب کی بے پناہ دولت سے اناج کی جو چند بالیاں وہ ہندوستان کے کروڑوں انسانوں کو تباہی سے بچانے کے لئے لانا چاہتے تھے، اُن کی اخلاقی اور جسمانی صحت درست کرنے کے لئے جو مالی اعانت اُنھیں درکار تھی، کیا وہ یہ سب اپنے ساتھ لا رہے تھے؟

نہیں! اس لحاظ سے اُن کا سفر ناکام تھا۔ اُن کا کام اب ایک نئی بنیاد پر شروع کرنا تھا۔ ہندوستان کو ہندوستان ہی سے قوّت پہونچانا تھا اور صحت مندی خود اُس کے اندر ہی سے پیدا کرنی تھی۔

لیکن اس صبر آزما اور مشکل کام کو تکمیل تک پہونچانے کے لئے جواب وہ بغیر کسی تذبذب کے اپنے ذمّہ لے رہے تھے، یہ مغربی یاترا اس نوجوان رہنما کو، جسے موت نے تاک لیا تھا اور خود اُسے بھی اس کا احساس تھا، وہ چیز دے رہی تھی جو پہلے حاصل نہ تھی، (اور وہ چیز تھی) اقتدار اور اختیار۔

————:(٭):————

ہندوستان کی واپسی

امریکہ کے اجتماعِ مذاہب (پارلیمنٹ آف ریلیجنس) میں وویکانند کو جو کامیابی ہوئی تھی اُس کی خبر ہندوستان ذرا دیر میں پہنچی لیکن ایک دفعہ جب اس کا علم ہو گیا تو اُس نے مسرّت اور قومی افتخار کے جذبات کا طوفان پیدا کر دیا۔ اس کی خبر سارے ملک میں پھیل گئی۔ بارنا گور کے سادھوؤں کو چھ مہینے تک کچھ نہ معلوم ہوا، انھیں اس کا اندازہ بھی نہ تھا کہ شکاگو کا ہیرو خود انھیں کا ایک ساتھی تھا۔ انھیں یہ بات وویکانند کے ایک خط سے معلوم ہوئی اور اِس خوشی میں انھیں رام کرشن کی ایک پیش گوئی یاد آئی۔ "نرن دنیا کی بنیادیں ہلا دے گا۔" راجہ مہاراجہ، پنڈت اور عوام سب خوش تھے۔ ہندوستان نے اپنے فاتحِ میرِ میدان کا جشن منایا۔ مدراس اور بنگال میں، جہاں خیالات جلد بھڑک اُٹھتے ہیں، جوش و خروش اپنے عروج پر پہونچ گیا۔ شکاگو کانگریس کے سال بھر بعد، ۵ ستمبر ۱۸۹۴ء کو کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں ہر طبقہ کے لوگوں اور ہر خیال کے ہندوؤں کی نمائندگی تھی۔ یہ سب لوگ وویکانند کو خراجِ عقیدت پیش کرنے اور امریکی قوم کا شکریہ ادا کرنے کے لئے جمع ہوتے تھے۔ امریکہ

کو ایک طویل خط بھیجا گیا جس پر مشہور حضرات کے دستخط تھے۔ بعض سیاسی جماعتوں نے ویویکانند کے کارناموں کے ذریعہ فائدہ حاصل کرنا چاہا لیکن جب ویویکانند کو یہ بات بتائی گئی تو انھوں نے بڑے جوش سے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ انھوں نے ہر ایسی تحریک میں حصّہ لینے سے انکار کر دیا جو غیر جانبدار ہو۔

"میں کامیابی یا ناکامی کی پروا نہیں کرتا ۔۔۔۔ یا تو میں اپنی تحریک کو پاک صاف رکھوں گا یا کوئی تحریک ہی نہ ہوگی۔"

لیکن انھوں نے اپنا رابطہ اپنے مدراس کے نوجوانوں سے ختم نہیں کیا تھا اور انھیں مستقل ہمّت افزا اور پُر جوش خط لکھتے رہتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ یہ لوگ خدا کے سپاہی بن جائیں، مرتے دم تک غریب اور ایماندار ۔۔۔۔

"میرے بھائیو! ہم غریب ہیں، ہم کچھ بھی نہیں ہیں۔ لیکن ہمیشہ ایسے ہی لوگ اُس سب سے اعلیٰ (یعنی خدا) کے آلۂ کار بنے ہیں۔"

مغرب سے اُن کے خطوط نے پہلے ہی سے تحریک کے خط و خال معین کر دئے تھے یہ تھی "ہندوستان کے عوام کو اوپر اُٹھانے کی پوری ذمّہ داری"۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے (ضروری ہے) "انفرادی قوتوں کو مجتمع کرنا، اطاعت کی صفت پیدا کرنا اور دوسروں کے لئے مِل جُل کر کام کرنا" وہ دُور سے بیٹھے اُن کی ترقی کی نگرانی کر رہے تھے، انھوں نے مدراس سے ایک ویدانتی رسالہ برمھ وادِن نکالنے کیلئے روپیہ بھیجا جو اُن کی عدم موجودگی میں اُن کا علم بلند رکھے۔ تھکن کے بڑھتے جانے کے باوجود، اُن کے آنے کے دن جس قدر قریب آتے جاتے تھے، اُسی قدر ہندوستان کے نام اُن کے پیغام بانگِ درا بنتے جاتے تھے!

"بڑے بڑے کام کرنے کو پڑے ہیں۔۔۔۔ میرے بچو! بالکل نہ ڈرو۔ ہمت کرو!
میں ہندوستان واپس آرہا ہوں اور میں اس کی کوشش کروں گا کہ جو کچھ کرنا ہے اس کا
آغاز کردوں، مضبوط دل والو! کام کئے جاؤ، خدا تمھاری پشت پر ہے!"

انھوں نے اپنے اس خیال کا اعلان کیا کہ وہ مدراس اور کلکتہ میں دو مرکز قائم کرنے
کا ارادہ رکھتے ہیں، پھر بعد میں بمبئی اور الہ آباد میں دو اور۔ ایک مرکزی تنظیم میں وہ اپنے
رام کرشن کے ساتھ والے بھائیوں کو مجتمع کریںگے اور ایک دوسرے مشن میں جو عالمگیر محبت اور
ہمدردی پر مبنی ہوگا اپنے شاگردوں اور مغرب کے مددگاروں کو، جو خدمت کر کے
ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا کو فتح کرے گا۔

اس لئے وہ یہ امید کرتے تھے کہ ان کے پہونچتے ہی ان کی فوج ان کے احکام
پر عمل کرنے کے لئے تیار ملے لیکن انھیں اس کی امید ہرگز نہیں تھی کہ پوری ہندوستانی
قوم اٹھ کھڑی ہوگی اور اس جہاز کے پہونچنے کا انتظار کرے گی جو اس کے ہیرو اور فاتحِ
مغرب کو لئے ہوئے آرہا تھا۔ اس بڑے شہر میں سماج کے ہر طبقہ کے لوگوں کی سوسائٹیاں
بنادی گئی تھیں جو انھیں خوش آمدید کہیں۔

سڑکوں پر فتح مندی کے پھاٹک بنائے گئے تھے اور مکانوں کو آراستہ کیا گیا تھا۔
جوش و خروش اتنا تھا کہ بہت سے لوگ ان کے آنے کا انتظار بھی نہ کرسکے اور سب سے
پہلے ان کا استقبال کرنے کے لئے ہندوستان کے جنوب میں اس جگہ کے لئے روانہ ہوگئے
جہاں سیلون میں ان کا جہاز لنگر ڈالنے والا تھا۔

جب وہ ۱۵ جنوری ۱۸۹۷ء کو پہونچے تو بندرگاہ پر اکٹھا ہونے والے زبردست
انسانی مجمع نے پُرجوش نعرے بلند کئے۔ بہت سے لوگوں نے تو خود کو گرادیا کہ ان کے

پاؤں چھو سکیں۔ جھنڈے لئے ہوئے ایک جلوس نکل پڑا، مذہبی بھجن اور گیت گائے گئے، راستہ میں پھول برسائے گئے، گلاب اور گنگا جل چھڑکا گیا اور گھروں کے سامنے خوشبوئیں جلائی گئیں۔ ہزارہا امیر اور غریب اُن کے لئے نذر لے کر آئے۔

اور وویکانند نے ایک بار پھر اس ملک کو جنوب سے شمال تک عبور کیا جیسے وہ پہلے انھیں سڑکوں پر ایک بھکاری کے رُوپ میں کر چکے تھے۔ لیکن آج اُن کے قدم فاتحانہ اُٹھ رہے تھے اور اُن کے جلو میں ایک پر جوش مجمع تھا، راجہ مہاراجہ اُن کے سامنے تعظیم کے لئے جھکتے اور اُن کی گاڑی کھینچ رہے تھے، توپیں داغی جا رہی تھیں اور اس پر ہیجان جلوس میں جہاں ہاتھی اور اونٹ سوار بھی تھے، ساز فتحمندی کے شادیانے بج رہے تھے۔

وہ اُن لوگوں میں تھے جو نہ جنگ سے بھاگتے ہیں نہ فتح سے، اُن کا خیال تھا کہ یہ اُن کا نہیں اُن کے پیام کا احترام ہے۔ ایک سنیاسی جس کے پاس نہ دنیوی ساز و سامان ہے نہ نام و نمود، نہ گھر، جو اپنے پاس خدا کے سوا اور کچھ نہیں رکھتا، اس کی اس طرح کی قومی استقبال کی غیر معمولی نوعیت پر وہ عام جلسوں میں اسی حیثیت سے زور دیتے تھے۔ وہ اپنی طاقتیں اسی لئے جمع کر رہے تھے کہ مقدس بوجھ کو اچھی طرح اُٹھا سکیں۔ ایک بیمار انسان ہوتے ہوئے جب اپنی قوّت کو محفوظ رکھنے کی ضرورت تھی، انھوں نے فوق البشری انداز سے اپنی قوّت صرف کی۔ سارے راستہ میں انھوں نے اپنی شاندار تقریروں کا بیج بویا، ایسی خوبصورت اور پُرزور تقریریں ہندوستان نے کبھی نہیں سُنی تھیں، اُنھوں نے ملک کے اِس سِرے سے اُس سِرے تک سنسنی پھیلا دی۔ اب مجھے یہاں رُک جانا چاہئے کیونکہ یہی اُن کے کام کی انتہائی منزل ہے۔ دنیا کے دوسری طرف سے جہاز کی واپسی پر وہ اپنے ساتھ تجربات کا ذخیرہ لائے۔ مغرب سے اُن کے طویل رابطہ نے انھیں ہندوستان کی شخصیت کا اور زیادہ احساس

دلایا اور اس کے مقابل ان کے دل نے مغرب کی تہہ دار اور مضبوط شخصیت کی قدر و قیمت محسوس کی۔ یہ دونوں باتیں انھیں ضروری معلوم ہوتی تھیں کیونکہ ان سے ایک دوسرے کی تکمیل ہوتی تھی دونوں اُن کے اِس پیام کے منتظر تھے جو انھیں ملا دیں اور یہ وہی تھے جو اس اتحاد کے لئے راہ کھولنے والا تھے۔

• • • • • •

اگرچہ اُن کے کولمبو کے خطبے (ہندوستان ایک مقدس سرزمین، فلسفۂ ویدانت) اور وہ خطبہ جو انھوں نے انورادھ پور میں انجیر کے درخت کے سایہ میں دیا جہاں بدھ مذہب کے کٹر ماننے والوں کی موجودگی کے باوجود انھوں نے "عالمگیر مذہب" کی تقریب منائی اور رامیشورم کا وہ خطبہ جس میں انھوں نے مسیح سے ملتے جلتے یہ الفاظ کہے: "شیو کی پرستش غریبوں، بیماروں اور کمزوروں میں کرو!" جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے راجہ پر خیرات کے دورے کی سی کیفیت طاری ہوگئی، سب پُر اثر تھے لیکن انھوں نے اپنی اہم ترین کوششیں مدراس کے لئے محفوظ رکھی تھیں۔ مدراس ہفتوں سے ایک ہیجانی حالت میں اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ وہاں اُن کے فاتحانہ داخلہ کے لئے سترہ[۱۷] پھاٹک لگائے گئے، ہندوستان کی مختلف زبانوں میں چوبیس[۲۴] سپاسنامے پیش کئے گئے اور نو دن ہنگامہ خیز جشن میں سارے کاروبار بند رہے.....

عوام کی جوش و خروش سے بھری ہوئی اُمیدوں کا جواب اُنھوں نے ہندوستان کے نام ایک پیام سے دیا، ایک ناقوس بجایا جس میں رام، شیو اور کرشن کی سرزمین کی نئی زندگی کی بشارت اور باہمت روح اور غیر فانی آتما کو مہم پر نکل پڑنے کی دعوت تھی۔ وہ ایک سپہ سالار تھے جو اپنی مہم کے نقشہ کی توضیح کرتے

اور اپنی قوم کو اجتماعی طور سے اُٹھ کھڑے ہونے پر آمادہ کرتے تھے: "میرے ہندوستان! اُٹھ کھڑا ہو؟ تیری قوّتِ حیات کہاں ہے؟ تیری غیر فانی روح میں......"

"ہر فرد کی طرح ہر قوم کی زندگی کا بھی ایک موضوع خاص ہوتا ہے جو مرکزی حیثیت رکھتا ہے، ایک بنیادی راگ جس کے گرد دوسرے راگ ہم آہنگی پیدا کرنے کیلئے لائے جاتے ہیں...... اگر کوئی قوم اپنی قوّتِ حیات کو خود سے الگ کر دینے کی کوشش کرتی ہے، جو صدیوں کے عمل سے مستحکم ہوتی ہے، تو وہ قوم مر جاتی ہے ....بعض ملکوں میں، جیسے انگلستان اُسکی سیاسی طاقت قوّتِ حیات ہوتی ہے، بعض کی صنّاعانہ طاقت اور اسی طرح اور...... ہندوستان میں مذہبی زندگی کو مرکزی جگہ حاصل ہے، یہی قومی زندگی کے نغمۂ حیات کا بنیادی سُر ہے...... اس لئے اگر تم اپنے مذہب سے دور رہنے میں کامیاب ہو جاتے ہو اور وہ جگہ سیاسیات یا سماج کو دے دیتے ہو...... تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ختم ہو جاؤ گے...... سماجی اصلاح اور سیاسیات کی تبلیغ بھی تمھاری مذہبی قوّت کے وسیلہ ہی سے ہو سکتی ہے ...... ہر شخص کو اپنی راہ خود پسند کرنی پڑتی ہے، یہی ایک قوم کے لئے بھی ہے۔ ہم نے صدیوں پہلے اپنا انتخاب کر لیا تھا..... یہ ایک غیر فانی روح میں ایمان رکھنا ہے...... میں دعوے سے کہتا ہوں کوئی اسے چھوڑ کر دیکھے تو؟ ..... تم اپنی فطرت کیسے بدل سکتے ہو؟"

شکوے نہ کرو! تمھارا حصّہ زیادہ ہے۔ اس قوّت سے کام لو جو تمھارے ہاتھ میں ہے! یہ اتنی عظیم قوّت ہے کہ اگر تم اسے محسوس کرو اور خود کو اس کا اہل بناؤ تو تم دنیا میں انقلاب لا سکتے ہو۔ ہندوستان روحانیت کی گنگا ہے۔ اینگلو سیکسن قوموں کی فتوحات نے اس کی لہروں پر بند باندھنا تو دور رہا اسے مذہبھ بھو نچائی ہے۔

انگلستان کی قوّت سے دُنیا کی قوموں میں اتحّاد پیدا کیا ہے، اُس نے سمندری راہیں کھول دی ہیں تاکہ ہندوستانی رُوح کی لہریں پھیلتی جائیں یہاں تک کہ وہ زمین کے آخری کناروں کو رنگ دیں (وویکانند اس میں یہ بھی جوڑ سکتے تھے کہ رومن حکومت کی تشکیل مسیحی فتوحات کے لئے ہوئی تھی کیونکہ انھیں اس حقیقت کا علم تھا......)

پھر ہندوستان کی روح کیا ہے؟ یہ نیا عقیدہ، نیا پیام کیا ہے، دنیا جس چیز کی منتظر ہے؟......

"دوسرا عظیم الشان خیال جو آج دُنیا ہم سے چاہتی ہے اور غالباً دُنیا کے اعلیٰ طبقوں کے مقابلہ میں نچلے طبقے، پڑھے لکھے لوگوں کے مقابلہ میں اَن پڑھ اور طاقتوروں کے مقابلہ میں کمزور زیادہ چاہتے ہیں، ساری کائنات کی رُوحانی وحدت اور ایک ایسی حقیقتِ مطلق کا زندہ اور زبردست خیال ہے جو تم میں اور ہر ایک میں، ذات میں اور روح میں جاری و ساری ہے۔ روح کی وحدتِ مطلق اخلاق کی جاودانی توثیق ہے، وہ اس طرح کہ ہم اور تم صرف بھائی بھائی نہیں..... بلکہ ایک ہیں.... یورپ کو بھی اس کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی ہماری کچلی ہوئی قوموں کو، اور یہ عظیم الشان اصول اس وقت غیر شعوری طور پر اِن تمام تازہ ترین سماجی اور سیاسی خیالات کی بنیاد بن رہا ہے جو انگلستان، جرمنی، فرانس اور امریکہ میں رُونما ہو رہے ہیں"

اس کے علاوہ یہی بنیاد ہے قدیم ویدانتی عقیدے، توحیدی ویدانت اور ہندوستان کی قدیم رُوح کے پاکیزہ اور خالص ترین اظہار کی......

"میں نے ایک دفعہ یہ شکایت سُنی کہ میں ادوّیت (توحیدِ مطلق) کی تلقین بہت زیادہ اور ثنویت کی بہت کم کرتا ہوں۔ ہاں، میں جانتا ہوں کہ مذہب کے ثنویتی عقیدے

میں کیسی عظمت، محبت کے کیسے بحرِ مواج اور کیسی بے پناہ برکتیں اور مسرتیں ہیں میں یہ سب کچھ جانتا ہوں لیکن اب وہ وقت نہیں ہے کہ خوشی میں بھی روئیں، ہم بہت رو چکے، اب اس کا وقت بالکل نہیں رہا کہ ہم نرم دل ہوں۔ اس نرم دلی نے ہمیں روئی کا گالا بنا دیا ہے ...... اس وقت ہمارے ملک کو لوہے کے اعصاب اور فولاد کی رگیں درکار ہیں، زبردست قوتِ ارادی کی ضرورت ہے جس کا کوئی مقابلہ نہ کر سکے جو...... کسی طرح سے بھی ہو اُن کے مقصد کی تکمیل کرے، چاہے اس کے لئے انھیں سمندر کی تہہ میں بھی جانا پڑے اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کرے۔ ہم یہ چاہتے ہیں اور اس کی ابتدا، قیام اور استحکام ادوَیت ہی کے آدرش کو سمجھنے اور حاصل کرنے سے ہو سکتی ہے، وہ آدرش جو سب کی وحدت کا ہے، ایمان، ایمان اور اپنے اوپر ایمان ...... اگر تم نے اُن تینتیس کروڑ اساطیری دیوتاؤں پر اور اُن دیوتاؤں پر ایمان رکھا جو غیروں نے تمھارے درمیان پیدا کر دئے ہیں اور اپنے اوپر نہیں رکھا تو تمھاری نجات نہیں ہو سکتی ...... اس کا کیا سبب ہے کہ ہم تینتیس کروڑ انسان ہر چھوٹی سے چھوٹی جماعت کے ہزار ہا سال سے محکوم رہے ہیں؟..... اس لئے کہ انھیں اپنے اوپر اعتماد تھا اور ہمیں نہ تھا...... میں اخباروں میں پڑھتا ہوں کہ جب ہمارا کوئی غریب ہم قوم انگریزوں کے ہاتھ قتل ہوتا یا اذیت اٹھاتا ہے تو سارے ملک میں کیسا شور مچ جاتا ہے۔ میں پڑھتا اور روتا ہوں لیکن دوسرے ہی لمحہ میں مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟...... انگریز ہرگز نہیں یہ ہم ہیں جو اپنی پستی کے ذمہ دار ہیں۔ ہمارے صاحبِ اقتدار اسلاف ہمیشہ ہمارے عوام کو اپنے پیروں تلے کچلتے رہے یہاں تک کہ وہ مجبور ہو گئے، اس مصیبت میں

وہ تقریباً یہی بھول گئے کہ وہ بھی انسان ہیں۔ وہ صدیوں سے صرف لکڑی کاٹنے والے اور پانی بھرنے والے رہ گئے ہیں اس لئے وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ وہ غلام بننے، لکڑی کاٹنے اور پانی بھرنے کے لئے ہی پیدا ہوتے ہیں۔"

"اس لئے اے میرے آئندہ بننے والے مصلحو! وطن دوستو! اس بات کو محسوس کرو! کیا تم یہ محسوس کرتے ہو؟ کیا تم اسے محسوس کرتے ہو کہ دیوتاؤں اور رشیوں کی لاکھوں اولادیں جانوروں کے برابر ہو چکی ہیں؟ کیا تم اسے محسوس کرتے ہو کہ لاکھوں آج فاقے سے ہیں اور لاکھوں صدیوں سے بھوکے مر رہے ہیں؟ کیا تم اسے محسوس کرتے ہو کہ جہالت اس ملک پر کالے بادل کی طرح چھا گئی ہے؟ کیا ان باتوں سے تمھیں بے چینی ہوتی ہے؟ کیا اس سے تمھاری نیندیں اُڑ جاتی ہیں؟..... کیا انھوں نے تمھیں پاگل کر دیا ہے؟ کیا اس تباہ کاری کی تکلیف نے تمھارے دل میں جگہ بنائی ہے اور تم اپنے نام، شہرت، بیوی بچوں، املاک اور خود اپنے کو بالکل بھول چکے ہو؟ محبِ وطن بننے کی پہلی شرط یہی ہے! صدیوں سے لوگوں کو زوال کے نظریات بتائے جا رہے ہیں۔ اُن سے کہا گیا ہے کہ تم کچھ بھی نہیں ہو۔ ساری دنیا کے عوام کو بتایا گیا ہے کہ وہ انسان نہیں ہیں۔ صدیوں سے وہ اس قدر ڈرائے گئے ہیں کہ وہ تقریباً جانور بن گئے ہیں۔ انھیں کبھی آتما کے متعلق سُننے کا موقع نہیں دیا گیا۔ انھیں آتما کی بات بتاؤ، بتاؤ کہ وہ جو ذلیل سے ذلیل ہیں اُن کے اندر بھی آتما ہے، جو نہ کبھی مرتی ہے نہ پھر پیدا ہوتی ہے اسے نہ تلوار کاٹ سکتی ہے، نہ آگ جلا سکتی ہے، نہ ہوا خشک کر سکتی ہے، وہ لافانی ہے، نہ اس کی ابتداء ہے نہ انتہا، وہ پاک ہے، قادر ہے اور حاضر و ناظر ہے....."

"اور یہاں ہر مرد، عورت اور بچّہ کو، ذات پات اور جنم، قوّت اور کمزوری کی تفریق

کے بغیر یہ سننے اور سمجھنے دو کہ قوی اور ضعیف، اعلیٰ اور ادنیٰ سب کے پیچھے روحِ مطلق ہے جو ہر ایک کو اچھا اور بُرا بننے کے لامحدود امکانات اور استعداد کا یقین دلاتی ہے۔ ہمیں ہر شخص سے اس کا اعلان کرنا چاہیئے: اُٹھو، بیدار ہو، اور اس وقت تک نہ رُکو جب تک کہ منزل ہاتھ نہ آجائے۔ اُٹھو، جاگو، کمزوری کے اس طلسم سے باہر نکلو۔ درحقیقت کوئی بھی کمزور نہیں ہے۔ روح لامحدود، قادرِ مطلق اور ہمہ بیں ہے۔ کھڑے ہو جاؤ اور اپنے وجود کو منواؤ، اپنے اندر کے خدا کو نمایاں کرو، اس کی نفی نہ کرو!....."

"ہم کو ایسا مذہب چاہیئے جو انسان کو انسان بنائے ..... ہمیں انسان بنانے والی ہمہ گیر تعلیم چاہیئے، ہمیں انسان بنانے والے نظریئے درکار ہیں۔ اس کی صداقت کو آزمانے کی ترکیب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو تمھیں جسمانی، ذہنی اور روحانی طور سے کمزور بناتی ہے اُسے زہر سمجھ کر رد کر دو۔ اس میں زندگی نہیں ہے، یہ سچ ہو ہی نہیں سکتی۔ سچائی قوت بڑھاتی ہے، سچائی پاکیزگی ہے اور سچائی علم ہے..... سچائی کو طاقت افزا ہونا چاہیئے دماغ کو روشن کرنے والی اور جاں بخش ہونا چاہیئے ..... ضعف پیدا کرنے والے صوفیانہ خیالات ترک کرو اور مضبوط بنو..... بڑی سچائیاں دُنیا کی سب سے سادہ چیز ہوتی ہیں، ایسی سادہ جیسے خود تمھارا وجود....."

"اس لئے میرا منصوبہ یہ ہے کہ ایسے ادارے قائم کروں جو ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر ہماری مقدس کتابوں کی تبلیغ کرنے کی تعلیم دیں۔ آدمیوں کی ضرورت ہے آدمیوں کی، دوسری ہر چیز مل جائے گی لیکن مضبوط، محنتی اور باعقیدہ نوجوانوں کی ضرورت ہے جو سر تا پا مخلص ہوں۔ ایسے سَو مل جائیں تو دُنیا میں انقلاب لایا جاسکتا ہے قوتِ ارادی ہر چیز سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے، ہر چیز کو اس کے سامنے جھکنا پڑے گا

کیونکہ یہ خدا کی طرف سے ہوتی ہے ..... ایک مخلص اور مضبوط قوّتِ ارادی قادرِ مطلق ہوتی ہے ......"

"اگر وراثت کی بنیاد پر ایک برہمن ایک نیچ ذات کے مقابلے میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان زیادہ رکھتا ہے تو برہمن کی تعلیم پر اور رقم خرچ نہ کرو۔ بلکہ سب کچھ نیچی ذات والے پر خرچ کرو۔ کمزوروں کو دو کیونکہ انھیں دان کی ضرورت ہے۔ اگر برہمن عقلمند پیدا ہوا ہے تو وہ بغیر کسی مدد کے تعلیم حاصل کر لے گا..... میرے خیال میں یہی انصاف اور عقل ہے۔"

"آئندہ پچاس سال کے لئے ..... تمام بیکار خداؤں کا تصوّر ہمارے ذہن سے نکل جانا چاہئے۔ صرف یہی ایک خدا ہے جو بیدار ہے، ہماری اپنی قوم۔ ہر جگہ اُسی کے ہاتھ، اُسی کے پیر، اسی کے کان ہیں، وہ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ تمام دوسرے خدا سو رہے ہیں۔ ہم کن بیکار خداؤں کے پیچھے دوڑیں جب کہ وہ خدا جو ہمارے چاروں طرف ہیں (وراٹ!) ہم انھیں کی پرستش نہیں کر سکتے؟ اُنھیں (وراٹ) کی پرستش سب سے پہلی جگہ رکھتی ہے جو ہمارے گرد و پیش ہیں..... یہ سب ہمارے خدا ہیں۔ آدمی اور جانور، پہلے خدا جن کی ہمیں پرستش کرنا ہے ہمارے اہلِ وطن ہیں....."

اِن الفاظ کی گونجتی ہوئی لہروں کا تصوّر کیجئے! پڑھنے والا بھی ہندوستانی عوام اور خود وویکانند کے ساتھ کہہ اُٹھے گا: "شیو! ...... شیو!"

طوفان گزر گیا۔ اس نے پانی اور آگ کے جھرنے میدانوں میں پھیلا دئے اور روحانی فوج، انسان کے اندر سوتے ہوئے خدا اور اُس کے لامحدود امکانات کی زبردست اشاعت بھی کر دی! میں تصوّر میں اس رشی کو سیدھا کھڑا، رمیہ آں کے نقش میں لازر کی قبر پر مسیح کی طرح اپنا ہاتھ اوپر اٹھائے دیکھ سکتا ہوں جس کے اندازِ تکلّم سے ایسی قوّت

نکل رہی ہے جو مُردے کو زندہ کر دے ......

کیا مُردے جی اُٹھے؟ کیا اُس کے الفاظ کی آواز پر چونک اُٹھنے والے ہندوستان نے اپنے اس پیغامبر کی اُمید پر لبیک کہا؟ کیا اُس کا پُرشور جوش و خروش عمل میں تبدیل ہوا؟ اُس وقت تو درحقیقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ شعلہ دھوئیں میں گم ہو گیا۔ دو برس بعد وویکانند نے کسی قدر تلخی سے اس کا اعلان کیا کہ اُن کی فوج کے لئے نوجوانوں کی جس فصل کی ضرورت تھی وہ انھیں ہندوستان میں نہیں ملی۔ ایک قوم جو خوابوں میں دفن ہے، تعصبات میں گرفتار ہے اور معمولی سی جدوجہد کرنے میں بھی ناکامی کا احساس کرنے لگتی ہے، اُس کی عادتوں کو ایک لمحہ میں بدل دینا ناممکن ہے لیکن سوامی کے تند و تیز جھونکوں نے اُسے پہلی دفعہ نیند میں کروٹ لینے پر مجبور کیا اور پہلی دفعہ اس کی نیند ہی میں خدا کے شعور کے ساتھ ہندوستان کے آگے بڑھنے کا صبر بھونکا گیا۔ اُسے وہ قوم کبھی نہ بھول سکی۔ اُسی دن سے اس سوتے ہوئے دیو کی بیداری کا آغاز ہوا۔ اگر وویکانند کے انتقال کے تین سال بعد آنے والی نسل نے بنگال کی بغاوت کا نظارہ کیا جو تلک اور گاندھی کی تحریک کا پیش خیمہ بن گئی اور اگر موجودہ ہندوستان کے (یہ کتاب ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء میں لکھی گئی) منظم عوام اجتماعی تحریک میں باقاعدہ شریک دکھائی دیتے ہیں تو یہ سب اُن کے مدراس کے پیغام "لازر! قبر سے باہر آ!" کی ابتدائی ٹھوکر کا نتیجہ ہے۔

اس حیات بخش پیام کے دُہرے معنی تھے: ایک قومی اور دوسرا عالمگیر۔ اگرچہ اِس توحیدی ویدانت کے مبلّغ کے یہاں اس کے آفاقی پہلو کو اہمیت حاصل تھی لیکن یہ اس کا قومی پہلو تھا جس نے ہندوستان کی رگوں میں جان ڈال دی۔ کیونکہ اُس نے اِس جذبے کی حرارت قبول کر لی جو اس وقت ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا اور وہ تھا قومیت کا

مہلک جذبہ، جس کے ظالمانہ اثرات ہم آج دیکھ رہے ہیں۔ اپنی ابتداء ہی سے یہ خطرات سے بھرا ہوا تھا۔ اس بات سے ڈرنے کے اسباب موجود تھے کہ اس کی اعلیٰ روحانیت اپنے تمام احمقانہ مظالم کے ساتھ قوم یا نسل کے وحشیانہ فخر کے فائدے کے لئے موڑی جائے گی۔

ہم اس خطرے سے واقف ہیں، ہم نے ایسے بہت سے مقاصد کو، چاہے وہ کتنے ہی خالص اور پاک رہے ہوں، نہایت گندے قومی جوش کے لئے استعمال ہوتے دیکھا ہے لیکن پہلے اپنے قوم کے دائرہ میں ہی اس وحدت کا احساس کئے بغیر، غیر منظم ہندوستانی عوام میں انسانی وحدت کا تصور پیدا کرنا کیونکر ممکن ہوتا؟ ایک دوسرے کا زینہ ہے۔ پھر بھی میں ایک دوسرا راستہ پسند کرتا، ایک زیادہ مشکل راستہ لیکن زیادہ سیدھا، کیونکہ میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان لوگوں کی اکثریت جو قومیت کی منزل سے گذرتے ہیں، اپنی ہی جگہ پر رہ جاتے ہیں۔...... وہ اپنے عقیدے اور محبّت کی ساری قوت راستے ہی میں صرف کر دیتے ہیں۔.... لیکن وویکانند کا یہ مقصد نہ تھا، وہ اس معاملہ میں گاندھی کی طرح ہندوستان کی بیداری کو انسانی خدمت ہی کے رشتہ میں دیکھتے تھے۔ تاہم ایک گاندھی سے زیادہ محتاط وویکانند نے اوّل الذکر کی اس کوشش پر ناپسندیدگی ظاہر کی ہوتی کہ مذہب کی روح سیاسی عمل پر غالب رہے۔ کیونکہ جیسا ہم نے اُن کے امریکی خطوط کے سلسلہ میں دیکھا، ہر موقعہ پر وہ اپنے اور سیاست کے درمیان یہ کہہ کر ایک ننگی تلوار رکھ دیتے تھے.....

"میں سیاسیات کی حماقتوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گا۔" لیکن وویکانند کے ایسا انسان اپنے مزاج اور اپنی رُوح کو بھی پیشِ نظر ضرور رکھتا۔ وہ ایک با وقار ہندوستانی تھے جو اکثر فاتح انگریزوں سے اُن کے بڑھتے ہوئے مطالبات یا احمقانہ تحقیر سے ناراض ہو کر، تشدّد آمیز ردِّ عمل کا اظہار کرتے تھے، اسی وجہ سے عقیدتاً اُس کو رد کرنے کے

باوجود، اپنی طبیعت کے خلاف قومیت کے خطرناک جوش وخروش میں حصّہ لینے پر مجبور ہو جاتے! یہ اندرونی کشمکش اکتوبر ۱۸۹۸ئہ کے ابتدائی دنوں میں اُس بحران تک جاری رہی جب وہ تنہا کشمیر میں کالی دیوی کے ایک مندر میں چلے گئے (اس زمانے میں وہ جذبات کے اُن طوفانوں کا شکار تھے جو ہندوستان کی تباہی اور مصیبت کے خیال سے پیدا ہوتے تھے) وہاں سے وہ بالکل بدلے ہوئے باہر نکلے اور سسٹر نویدتا سے کہا "میری ساری حب الوطنی ختم ہو گئی ...... میں غلطی پر تھا۔ ...... ماتا (کالی دیوی) نے مجھ سے کہا: 'کیا ہوا اگر میرے مندروں میں بدعقیدہ لوگ آجاتے ہیں اور میری مورتیوں کو ناپاک کر دیتے ہیں؟ تمھیں اِس سے کیا مطلب؟ تم میری حفاظت کرتے ہو یا میں تمھاری حفاظت کرتی ہوں؟' اس لئے اب وطن پرستی ختم۔ میں محض ایک بچّہ ہوں!"

لیکن طوفان کے ہنگاموں میں اور مدراس کے خطبات کے آبشاروں کے شور میں لوگ کالی دیوی کے وہ تہدید آمیز اور پرسکون الفاظ نہ سُن سکے جس سے انسانی تکبّر میں کمی ہوتی ہے۔ لوگ دھارے کے جوش اور تیزی میں بہہ گئے۔

———:(۰):———

رام کرشن مشن کا قیام

انسانوں کا اچھا رہنما چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو بھی نظرانداز نہیں کرتا۔ وویکانند کو معلوم تھا کہ اگر انھیں ایک مقصد کے حاصل کرنے کے لئے لوگوں کی رہنمائی کرنا ہے تو محض اُن کے جذبات کو بھڑکا دینا کافی نہیں ہوگا بلکہ اُنھیں رُوحانی فوج میں بھرتی کرنا ہوگا۔ چند منتخب لوگوں کو نئے انسان کی مثال کے طور پر پیش کرنا ضروری ہے کیونکہ اُن کا وجود ہی نئے مسلک کی ضمانت ہوگا۔

اس وجہ سے وویکانند جیسے ہی اپنی مدراس اور کلکتہ کی فتوحات سے فارغ ہوئے اُنھوں نے فوراً اپنی توجّہ اپنے عالم بازار والے آشرم کی جانب مبذول کر دی۔

اپنے گُرو بھائیوں کو اپنے تصوّرات کی سطح تک اُٹھانے میں بڑی دشواریاں ہوئیں۔ اس عظیم الشان طائر نے ساری دُنیا کے اُوپر پرواز کی تھی اور اس کی نگاہوں نے وسیع افق کی پیمائش کر لی تھی، اس کے برعکس وہ لوگ دین داری سے اپنے گھر کے اندر ہی بند رہے اور اپنے کم آمیزی کے طور طریقوں کو برقرار رکھا۔ وہ اپنے اس عظیم المرتبت بھائی سے محبّت کرتے تھے لیکن اُسے ٹھیک سے پہچانتے نہیں تھے۔ سماجی اور قومی خدمت کے جس نئے

آدرش نے وویکانند کے دل میں آگ لگا رکھی تھی وہ اسے محسوس نہیں کر سکے۔ اپنے مروجہ تعصبات، مذہبی انفرادیت پسندی اور پُرسکون مراقبہ کی خاموش زندگی کی قربانی اُن کے لئے بیحد تکلیف دہ تھی اور بڑی نیک نیتی سے ایسے مذہبی اسباب ڈھونڈھ نکالنا اُن کے لئے مشکل نہ تھا جو اُن کی مخلصانہ خودپرستی کی تائید کرتے۔ انھوں نے اپنے گرو رام کرشن اور دُنیا سے اُن کی بے تعلقی کو بھی اپنی تائید میں پیش کیا۔ لیکن وویکانند کا دعویٰ یہ تھا کہ رام کرشن کے عمیق ترین خیالات کے وہی سچے راز داں ہیں۔ مدراس اور کلکتہ کے گونجتے گرجتے خطبات میں مسلسل انھوں نے رام کرشن ہی کا نام لیا تھا اور انھیں اس زندگی میں "اپنا گرو، اپنا آدرش، اپنا ہیرو اور اپنا خدا" کہا تھا۔ وہ اس کے مدعی تھے کہ وہ پرم ہنس کی آواز ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ یہاں تک گئے کہ انھوں نے ہر طرح کی جدت اور خیال کے نئے پن کی خوبیوں کا انکار کر دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ محض اُن کے وفادار کارندے ہیں جو اپنے گرو کے احکام ٹھیک سے بجا لا رہا ہے!

"اگر میں نے اپنے الفاظ، خیالات یا عمل سے کوئی کامیابی حاصل کی ہے، اگر کبھی میری زبان سے کچھ ایسے الفاظ نکلے ہیں جن سے دُنیا میں کسی کو کوئی فائدہ پہنچا تو میں اُن کا دعویدار نہیں ہوں، وہ اُنھیں (رام کرشن) کے ہیں ..... جو کمزوریاں ہیں وہ میری ہیں، جن میں جاں بخشی کی تاثیر، قوت، پاکیزگی ہے اِنھیں کے فیض سے ہے، وہ انھیں کے لفظ ہیں اور وہ خود ہیں۔"

ان دو رام کرشنوں کا کسی نہ کسی وقت متصادم ہونا لازمی تھا، ایک وہ جو اپنے شاگردوں کے اوپر بازو پھیلائے اپنے نشیمن ہی میں رہ گیا تھا اور دوسرا وہ جو اپنے اس عظیم شاگرد کے رُوپ میں اپنے انھیں شہپروں سے ساری دُنیا کے اُوپر پرواز کر آیا تھا۔ لیکن فتح

کسی وقت بھی مشکوک نہیں تھی، نتیجہ ظاہر تھا۔ صرف اس نوجوان فاتح کی زبردست رفعت، ذہنی برتری یا ہندوستان کے بلند بانگ استقبال کی عزّت کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے گرو بھائیوں اور خود رام کرشن کی محبّت کی وجہ سے۔ گرو نے اُسے پاک کیا تھا۔

اس لئے وہ لوگ اکثر دل سے اتفاق کئے بغیر اُن احکام کی تعمیل کرتے تھے جو ویویکانند اُن کے لئے جاری کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو اس پر مجبور کیا کہ وہ اُن کے یوروپی چیلوں کو بھی اپنی برادری میں شامل کریں اور سماجی فلاح اور خدمت کے کاموں میں مشغول ہو جائیں۔ انھوں نے بڑی سختی سے انھیں اس سے روکا کہ وہ صرف اپنی نجات کے متعلق سوچیں۔ انھوں نے اس کا اعلان کیا کہ وہ سنیّاسیوں کی ایک ایسی نئی جماعت قائم کرنے کے لئے آئے ہیں جو، اگر دوسروں کو بچانے کی ضرورت پڑ جائے تو جہنّم میں بھی جانے کو تیّار ہو۔ تنہائی کی عبادتوں کے بے جان خدا کا راج بہت دنوں تک رہا، اب انھیں زندہ خدا کی، مستقبل کے خدا کی، وِراٹ کی، جو ہر ذی روح کے اندر ہے، اس کی پرستش کرنا چاہئے! اور اب اُس "برہم کے شیر کو" جو ہر انسان کے دل میں سو رہا ہے، اُن کی آواز پر جاگ اٹھنا چاہئے!

نوجوان گرو کے احکام میں کچھ ایسی تاکیدی کیفیت تھی کہ اُن کے بے مثل ساتھی، جن میں سے بعض، عمر میں اُن سے زیادہ تھے، ان کے خیال پر اچھی طرح یقین کرنے سے پہلے ہی تعمیل کرتے تھے۔ خانقاہی زندگی سے علیحدگی اختیار کرنے کی سب سے پہلی مثال رام کرشنانند نے قائم کی جو اس علیحدگی کو سب سے زیادہ محسوس کرنے والے تھے کیونکہ گزشتہ بارہ سال میں اُنھوں نے ایک دن کے لئے بھی وہاں سے جُدائی اختیار نہیں کی تھی۔ وہ مدراس گئے اور وہاں انھوں نے جنوبی ہند میں ویدانتی اصولوں کی تبلیغ کے لئے ایک مرکز

قائم کیا۔ اِس کے بعد اکھنڈ آنند (گنگا دھر) نکلے جن کے دل پر جذبۂ خدمت کا نقش بہت گہرا تھا۔ وہ مرشد آباد پہونچے جہاں اُس وقت قحط کا زور تھا اور وہاں اُنھوں نے مُصیبت میں گرفتار لوگوں کے امدادی کام میں خود کو وقف کر دیا۔

شروع میں بہت سے غیر منظّم ڈھنگ سے فلاحی کام ہندوستانی عوام کے لئے کئے گئے لیکن وویکا نند کو اس بات کی بڑی فکر تھی کہ منصوبہ اور طریق کار ہمیشہ کے لئے ایک ہی بار مرتّب کر لیا جائے۔ ایک دن بھی ضائع کرنا مناسب نہیں۔ ہندوستانی عوام کو بیدار کرنے کے لئے انھوں نے واپسی کے بعد ابتدائی چند مہینوں میں جو فوق الانسانی قوّت صرف کی، اُس نے انھیں پُرانے مرض میں پھر سختی کے ساتھ مبتلا کر دیا۔ اس سال کے موسم بہار میں وہ دو دفعہ آرام کے لئے پہاڑوں پر جانے پر مجبور ہوئے، پہلی دفعہ کئی ہفتوں کے لئے دارجلنگ اور دوسری دفعہ (۶ مئی سے جولائی کے آخر تک) تقریباً ڈھائی مہینوں کے لئے المورہ۔

درمیانی وقفہ میں اُن کے اندر اتنی قوّت آگئی تھی کہ انھوں نے ایک نئے ادارے رام کرشن مشن کی بنیاد ڈال دی جو آج بھی موجود ہے اور اپنا کام جاری کئے ہوتے ہے۔

• • • • • •

یکم مئی ۱۸۹۷ء کو رام کرشن کے تمام سنّیاسی اور غیر سنیاسی چیلے کلکتہ میں، اپنے ہی ایک ساتھی بلرام کے گھر پر طلب کئے گئے۔ وویکا نند نے گرو کی حیثیت سے تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ ایک مضبوط تنظیم کے بغیر کوئی پائدار چیز قائم نہیں کی جا سکتی۔ ہندوستان کے سے ملک میں ایسے ادارے کی بنیاد جمہوری طریقہ پر رکھنا، جہاں ہر شخص کو رائے دینے کا برابر حق حاصل ہو اور فیصلے اکثریت کی بنیاد پر کئے جائیں عقلمندی کا کام نہ ہوگا۔ اس کیلئے

مناسب وقت وہ ہوگا جب ممبر عام فائدے کے لئے اپنے مفاد اور خاص تعصبات کو قابو میں رکھنا سیکھ جائیں۔ اس وقت انھیں ایک حاکم آمر کی ضرورت ہے وہ خود بھی اس وقت دوسروں کی طرح ایک متفقہ مالک رام کرشن کے کارکن کی حیثیت سے، اُن کے نام اور اُن کی مُہر سے کام کر رہے تھے۔

دویکانند کی تحریک پر حسب ذیل تجاویز منظور کی گئیں:

(۱) ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جائے جس کا نام "رام کرشن مشن" ہو۔

(۲) اس کا مقصد ہے اُن سچائیوں کی اشاعت کرنا جن کو رام کرشن انسانوں کی فلاح کے لئے پیش کرتے تھے اور اپنی عملی زندگی سے جن کی تعلیم دیتے تھے۔ دوسروں کی مدد کرنا تاکہ وہ اپنی زندگی میں اپنے مادی، ذہنی اور روحانی ارتقاء کے لئے اُن پر عمل کر سکیں۔

(۳) اس کا فرض یہ ہے کہ اس تحریک کے کاموں کو جس کی ابتدا رام کرشن نے کی تھی، صحیح جذبہ کے ماتحت چلائے" تاکہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان اس خیال کے ساتھ بھائی چارہ قائم ہو کہ یہ سب ایک ہی لافانی ابدی مذہب کے مختلف روپ ہیں"۔

(۴) اس کے کام کے طریقے یہ ہیں: (الف) "لوگوں کو اس طرح کی تعلیم دینا کہ وہ ایسے علوم اور سائنس لوگوں کو سکھانے کے قابل ہو سکیں جو عوام کی مادی اور روحانی بہتری میں معاون ہوں (ب) فنون اور صنعت کی ترقی اور ہمت افزائی" (ج) لوگوں میں عام طور سے ویدانتی اور دوسرے مذہبی خیالات پہونچانا اور پھیلانا جس طرح رام کرشن نے اُن کی وضاحت کی تھی۔

(۵) اس کے عملی شعبے دو ہوں گے: پہلا ہندوستانی مٹھ (خانقاہیں) اور آشرم (آرام کرنے کے مقام) ہندوستان کے مختلف حصّوں میں سنّیاسیوں اور ایسے گرہست ساتھیوں کے لئے قائم کئے جائیں گے "جو اپنی زندگیاں دوسروں کو تعلیم دینے کے لئے وقف کرنا چاہتے ہوں"۔ دوسرا شعبہ ہوگا غیر ملکی: یہ رُوحانی مرکز قائم کرنے اور "بیرونی اور ہندوستانی مرکزوں کے درمیان امداد باہمی اور ہمدردی کا گہرا رشتہ پیدا کرنے کے لئے" جماعت کے ممبروں کو ہندوستان سے باہر بھیجے گا۔

(۶) چونکہ مشن کے مقاصد اور نصب العین خالص روحانی اور انسانیت پرستانہ ہیں اس لئے سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔"

ویویکانند نے جو جماعت قائم کی اُس کی معیّن سماجی، انسان دوستانہ اور "کُل انسانی" پیمبرانہ نوعیت بالکل واضح ہے۔ جیسا کہ اکثر مذاہب کرتے ہیں، اس مسلک نے عقل پر اعتقاد اور نئی زندگی کی ضروریات کی مخالفت کرنے کے بجائے سائنس کو پہلی صف میں جگہ دی، مادّی اور رُوحانی دونوں طرح کے ارتقا سے تعاون کا اعلان کیا اور فنون اور مختلف صنائع کی ہمّت افزائی کی۔ لیکن اس کا اصل مقصد عوام کی بھلائی تھا۔ اس نے زور دیا کہ اس کے عقیدہ کا اصل جوہر مختلف مذاہب کے درمیان بھائی چارہ قائم کرنا ہے کیونکہ انھیں کی ہم آہنگی سے دائمی مذہب وجود میں آتا ہے۔ یہ سب کچھ رام کرشن کی سرپرستی میں ہو رہا تھا جن کے وسیع قلب نے سارے عالمِ انسانی کو اپنی محبّت کے دائرے میں لے لیا تھا۔

"مقدّس ہنس" پرواز کر چکا تھا، اس کے پروں کی پہلی ہی جنبش سارے کرّۂ ارض پر چھا گئی۔ اگر پڑھنے والا اس کے بانی کے جذبے کے لحاظ سے اس مکمّل پرواز کا خواب

دیکھنا چاہتا ہو تو وہ اسے اس خیالی گفتگو میں نظر آئے گا جو سوامی وویکانند اور شرت چندر چکرورتی کے درمیان (مارچ ۱۸۹۸ء بیلور میں) ہوئی۔

اس وقت پہلا کام سربراہوں کا انتخاب تھا جس میں عمومی وویکانند نے کلکتہ کے مرکز کے لئے برہمانند اور یوگانند کو صدر اور نائب صدر مقرر کر دیا، انھیں ہر اتوار کو بلرام کے گھر پر یکجا ہونا تھا پھر ذرا سی بھی تاخیر کئے بغیر وویکانند نے دو شعبوں، عوامی خدمت اور ویدانت کی تعلیم کا افتتاح کر دیا۔

سارے سنیاسی اگرچہ اُن کے احکام کی تعمیل کرتے تھے لیکن انھیں ان کی پیروی مشکل معلوم ہوتی تھی اور کبھی کبھی اُن کے درمیان بڑے دلچسپ مباحثے ہوتے تھے حالانکہ ان کی نوعیت برادرانہ رہتی تھی۔ وویکانند کا جوش، پُرخروش اور مزاج ہر وقت ان کے قابو میں نہیں رہتے تھے کیونکہ اندرونی تکالیف انھیں بے حد برانگیختہ کر دیتی تھیں اور کسی کسی وقت ان کی مخالفت کرنے والے اُن کے ہاتھ سے زخم بھی کھا جاتے تھے لیکن وہ اسے خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتے تھے کیونکہ "شاہی کھیل" ایسا ہی تھا۔ دونوں طرف باہمی خلوص کا یقین کارفرما رہتا تھا۔

کسی کسی وقت وہ لوگ اب بھی مراقبہ اور دھیان کی زندگی اور اپنے مجذوب بادشاہ، رام کرشن کی کشش محسوس کرتے۔ انھیں اس بات میں مزا آتا اگر وہ رام کرشن مشن کو بے عمل مراقبہ اور دھیان کے لئے مندر میں تبدیل کر سکتے لیکن وویکانند نے بیدردی سے اُن کے خواب چکنا چور کر دئے: "کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ رام کرشن کو اپنی چو حدی میں محدود کر لو؟ ...... شری رام کرشن اس سے بہت زیادہ رفیع اور عظیم ہیں جتنا اُن کے شاگرد سمجھتے ہیں۔ وہ لامحدود رُوحانی تصوّرات کا مجسمہ ہیں جو لامحدود طریقوں سے پھیلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اُن کی ایک نگاہِ لطف اسی ایک لمحہ میں ہزاروں وویکانند پیدا کر سکتی ہے۔ ہیں اُن کے خیالات کی نشرواشاعت

ساری دنیا میں کروں گا.....“

انھیں رام کرشن کی ذات جتنی عزیز تھی اس سے زیادہ ان کا پیغام قیمتی معلوم ہوتا تھا۔ ان کا یہ مقصد نہ تھا کہ وہ ایک نئے دیوتا کے لئے ایک عبادت گاہ قائم کریں بلکہ وہ اُن کے خیالات کے من وسلویٰ تمام انسانوں پر برسانا چاہتے تھے اور یہ خیالات سب سے پہلے اور سب سے زیادہ عمل میں ظاہر ہوسکتے تھے۔ ”مذہب اگر سچا ہے تو اُس کا عملی ہونا لازمی ہے۔“ انھیں یہ بات پسند آتی کہ ہر شخص ہر روز ایک بھوکے نارائن، لنگڑے یا اندھے نارائن کو یا اپنی حسب حیثیت ایسے ہی آدھے یا ایک درجن لڑکوں کو اپنے گھر لے جاتا، اُنھیں کھانا کھلاتا اور مندر میں جس شیو یا وشنو کی وہ خود پوجا کرتا ہے، اُن کو بھی اس میں شریک کرتا۔

اس کے ماسوا انھوں نے اس کی بھی احتیاط برتی کہ جذباتیت کسی نہ کسی بھیس میں اُن کے کاموں میں داخل ہوجائے کیونکہ اس سے انھیں نفرت تھی۔ بنگال کی نصارقت انگیز جذبات کے رجحان کے لئے بہت ساز گار تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں زندگی کا گلا گھُٹ گیا۔ ووِیکانند کو اس پر اصرار تھا اور اس لئے زیادہ اصرار تھا کہ اُسے خود اپنے اور دوسروں کے اندر سے نکال دینے کے بعد ہی کام شروع ہوسکتا تھا (مندرجہ ذیل منظر اس حقیقت کی دردانگیز تصویر پیش کرتا ہے)

ایک دن اُن کے ایک سنیاسی ساتھی نے، مذاق کے انداز میں اس بات پر اُن کی ملامت کی کہ انھوں نے رام کرشن کی وجد آفریں تعلیمات میں مغرب کے اُن تنظیمی، عملی اور فلاحی تصوّرات کی آمیزش کر دی ہے جنھیں رام کرشن کی تائید حاصل نہیں تھی۔ ووِیکانند نے طنز آمیز لہجے اور بے دردمزاحیہ انداز میں اپنے مخالف کو اور اُسی کے پردے میں

دوسرے سننے والوں کو جواب دیا (کیونکہ انھیں یہ محسوس ہوا کہ وہ لوگ بھی کہنے والے کے ہمخیال ہیں):

"تم جانتے کیا ہو؟ بالکل جاہل ہو...... تمھارا مطالعہ تو پرہلاد کی طرح پہلا ہی بنگالی حرف "ک" دیکھنے کے ساتھ ختم ہو گیا کیونکہ اس حرف نے پرہلاد کو کرشن جی کی یاد دلائی، اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ آگے کچھ نہ پڑھ سکے...... تم لوگ جذباتی قسم کے بیوقوف ہو! تمھیں مذہب کے بارے میں کیا معلوم ہے؟ تم تو بس اس کے لئے ہو کہ دونوں ہاتھ جوڑ کر دعا کرو، 'اے بھگوان' تیری ناک کتنی خوبصورت ہے! تیری آنکھیں کتنی پیاری ہیں! اور اسی طرح کی اور بے عقلی کی باتیں...... اس کے بعد تم سمجھتے ہو کہ تمھاری نجات کی ضمانت ہو گئی، آخری لمحہ میں سری رام کرشن آئیں گے اور تمھارا ہاتھ پکڑ کر تمھیں جنت کے سب سے اعلیٰ طبقہ میں پہونچا دیں گے...... تمھارے نزدیک مطالعہ، عوام میں تبلیغ اور انسان دوستی کے کام مایا ہیں کیونکہ انھوں نے کسی سے کہا تھا 'پہلے خدا کو تلاش کرو اور پا جاؤ، دنیا میں نیک کام کرنا تو گستاخی یا جسارت ہے'...... گویا خدا کو پا جانا اتنا ہی آسان تو ہے! گویا وہ ایسا ہی نادان تو ہے کہ ایک ضعیف العقل کے ہاتھ میں خود کو ایک کھلونے کی طرح دے دیگا!"

پھر اچانک انھوں نے کہا: "تم سمجھتے ہو کہ تم نے سری رام کرشن کو مجھ سے بہتر سمجھا ہے! تم سمجھتے ہو کہ گیان خشک قسم کا علم ہے جو دل کے نازک ترین احساسات کو ختم کر کے صرف ریگستانی راستوں سے گذر کر ہی حاصل کیا جاسکتا ہے! تمھاری بھگتی ایک رقت پسندانہ حماقت ہے جو انسان کو نامرد بنا دیتی ہے۔ تم رام کرشن کو اس طرح پیش کرنا چاہتے ہو جیسے تم نے انھیں سمجھ لیا ہے، اور یہ بہت کم درجہ کی سمجھ ہے! اس سے

ہاتھ اُٹھالو! تمھارے سمجھے ہوئے) رام کرشن کی کس کو فکر ہے؟ تمھاری بھگتی اور مُکتی کی کسے پروا ہے؟ کس کو اس کی پروا ہے کہ تمھاری مذہبی کتابوں میں کیا ہے؟ میں بڑی خوشی سے ہزارہا دوزخوں میں جانے کے لئے تیار ہوں اگر میں اپنے اہلِ وطن کو، جو تاریکی میں گھرے ہوئے ہیں، چونکا سکوں کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں اور ایسے انسان بنیں جن میں کرم یوگ کا جذبہ کارفرما ہے ...... میں رام کرشن کا یا کسی اور کا خدمتگار نہیں ہوں بلکہ صرف اُس کا ہوں جو اپنی بھگتی یا مُکتی کی پروا کئے بغیر دوسروں کی مدد اور خدمت کرتا ہے!"

ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ ان کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں، آواز رُندھ گئی اور جسم کانپنے لگا۔ یک بیک وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں بھاگ گئے۔ دوسرے لوگ بالکل مبہوت ہو کر خاموش بیٹھے رہے۔ چند لمحوں کے بعد ایک آدمی اُٹھے اور اُن کے کمرے میں جھانک کر دیکھا، ویویکانند زبردست عالمِ استغراق میں تھے وہ خاموشی سے منتظر رہے ...... ایک گھنٹہ کے بعد ویویکانند واپس آئے۔ اُن کے چہرے سے اب بھی گذرے ہوئے طوفان کے آثار نمایاں تھے لیکن اب انھیں سکون حاصل ہو گیا تھا۔ انھوں نے ملائمت سے کہا: "جب کوئی شخص بھگتی حاصل کر لیتا ہے تو اُس کے اعصاب اور دل اتنے نرم اور نازک ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک پھول کا لمس بھی برداشت نہیں کر سکتے! کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں آجکل کوئی ناول نہیں پڑھ سکتا؟ میں جذبات سے مغلوب ہوئے بغیر سری رام کرشن کے متعلق دیر تک باتیں نہیں کر سکتا اس لئے اس کی برابر کوشش کرتا رہتا ہوں کہ اپنے اندر سے اُبلتی ہوئی بھگتی کو دبائے رکھوں۔ میں اپنے کو گیان کی آہنی زنجیروں سے باندھ کر رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ ابھی اور اہلِ وطن

کے لئے میرے کام ابھی اُدھورے ہیں اور دنیا کو ابھی میرا پیغام پوری طرح نہیں پہونچا ہے۔ اس لئے جیسے ہی مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ بھگتی مجھ پر غلبہ حاصل کر کے مجھے اپنی جگہ سے ہٹا دینا چاہتی ہے، میں اُسے زبردست ٹھوکر دیتا ہوں اور جذبات دشمن گیان کو درمیان میں لاکر مضبوط اور ثابت قدم بن جاتا ہوں۔ ہاں مجھے بہت سے کام کرنے ہیں! میں رام کرشن کا داس ہوں جنھوں نے اپنا کام ادھورا چھوڑا تھا کہ میں اُسے پورا کروں گا۔ میں اس وقت تک آرام نہیں کروں گا جب تک انھیں انجام نہ دے لوں! اُوہ، انھیں مجھ سے کتنی محبت تھی!......"

جذبات کی وجہ سے پھر وہ آگے کچھ کہنے سے معذور ہو گئے۔ اس پر یوگانند نے اُن کے خیالات بدلنے کی کوشش کی کیونکہ انھیں اس کا خطرہ تھا کہ اُبال پھر نہ شروع ہو جائے۔

اس کے بعد کبھی وویکانند کے طریقِ کار کے خلاف احتجاج کی ایک آواز بھی نہیں اُٹھی۔ وہ ایسی کس بات پر اعتراض کرتے جسے وویکانند نے پہلے ہی سے نہیں سمجھ رکھا تھا؟ اب انھوں نے اُن کی اذیّت کوش رُوح کے اندر تک دیکھ لیا تھا۔

* * * * * * *

ہر مشن میں ایک ڈرامائی عنصر ہوتا ہے کیونکہ اس کی تکمیل اس کے قبول کرنے والے کو تکلیف پہونچا کر ہوتی ہے، اس کی فطرت کے ایک حصّہ، اس کے آرام، صحت اور کبھی کبھی بہترین خواہشات کی قربانی سے ہوتی ہے۔ وویکانند بھی اپنے اہلِ وطن کی اس فطرت میں شریک تھے جو خدا کا ایک خاص تصوّر رکھتی ہے، جو جہاں گرد سنیاسی بن کر اس زندگی اور اس دُنیا سے بھاگنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے، کبھی دھیان کی یکسوئی کیلئے،

کبھی مطالعہ کے لئے اور کبھی بھگتی کے لئے، اور بھاگ کر ایک غیر والبتہ رُوح کی طرح، جس کی کوئی جائے قیام نہیں ہے، مستقل پرواز میں رہنا چاہتی ہے تاکہ واحدِ مطلق سے اس کا رابطہ کسی وقت نہ ٹوٹے۔ جو لوگ انھیں نزدیک سے دیکھا کرتے تھے انھوں نے کبھی کبھی ان کے دِل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی تھکن اور افسوس کی ایک کراہ سُنی تھی۔

لیکن انھوں نے اپنی راہِ حیات خود منتخب نہیں کی تھی بلکہ مشن نے انھیں منتخب کر لیا تھا۔

"میرے لئے آرام نہیں ہے۔ رام کرشن جنھیں کالی دیوی کہتے تھے انھوں نے اُن کے مرنے سے تین چار دن پہلے جسم و رُوح پر غلبہ پا لیا تھا، وہی مجھے کام کرتے رہنے پر مجبور کرتی ہیں اور اس کی اجازت نہیں دیتیں کہ میں اپنی ذاتی ضرورتوں کی طرف کبھی دھیان دوں۔"

اس چیز نے ان کے دِل سے اپنی، اپنی خواہشات کی، اپنی بہتری کی، یہاں تک کہ اپنی صحت کی یاد بھی دوسروں کی بھلائی کے لئے نکال دی۔ یہی عقیدہ انھیں اپنی رُوحانی فوج میں بھی پیدا کرنا تھا۔ یہ اسی وقت ممکن تھا جب اُن میں قوتِ عمل کی رُوح پھُونکی جائے۔ اُن کا سابقہ ایک ایسی قوم سے تھا جو ضعفِ معدہ کا شکار تھی اور اپنے ہی رقیق جذبات سے سرشار۔ اسی وجہ سے انھیں سخت کوش بنانے کے لئے خود بھی کبھی کبھی سخت کوش بننا پڑتا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ "ان کے اندر ہر شعبۂ عمل میں رُوح کی وہ جذباتی ذہنی بلندی پیدا ہو جائے جس سے سرفروشی جنم لیتی ہے۔" یہ اسی طرح سر انجام پا سکتی تھی جب جسمانی اور روحانی کام، سائنسی تحقیقات اور انسانی خدمت سب ایک ساتھ چلیں۔

اگر وہ ویدانت کی تعلیم پر اس قدر زور دیتے تھے تو اس کا سبب یہ تھا کہ اس میں اُنھیں ہمہ گیر قسم کی مقوّی غذا نظر آتی تھی: "ویدک نغمہ کے گرجتے ہوئے سُروں سے نہ ملک کے

دوبارہ زندہ کرنا چاہتے تھے"۔

وہ دوسروں ہی کے دل نہیں توڑتے تھے بلکہ خود اپنا بھی، حالانکہ انھیں اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ دلِ ربانی سرچشمہ ہے۔ انسانوں کے رہنما کی حیثیت سے وہ اس کو مارنا نہیں اس کے ٹھیک محل پر رکھنا چاہتے تھے۔ جہاں دِل برتری حاصل کر لیتا تھا وہ اسے نیچے گراتے تھے، جہاں پست تر سطح پر ہوتا اُسے اوپر اُٹھاتے تھے۔ انسانی خدمت کے سلسلہ میں جو کام کرنے تھے اُن کے خیال میں وہ باطنی قوتوں میں صحیح توازن چاہتے تھے کیونکہ ان کی ضرورت شدید تھی اور عوام کی جہالت، تکالیف اور پریشانیاں زیادہ دیر تک انتظار نہیں کر سکتی تھیں۔

یہ صحیح ہے کہ توازن کبھی پائدار نہیں ہوتا۔ اس کا حل کرنا خاص طور سے دشوار ہے اور ان قوموں میں اس کا برقرار رکھنا اور دشوار ہے جو سربلندی کے سرخ شعلوں سے گزر کر محض خواہشات کی راکھ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ دویکانند کے ایسے شخص کے یہاں یہ ایک اور مشکل کام تھا کیونکہ وہ بیسیوں متضاد عناصر جیسے عقیدہ، سائنس، آرٹ اور تسخیر و عمل کے تمام جذبات میں گھرے ہوئے تھے۔ یہ حیرت ناک بات ہے کہ انھوں نے آخر تک اپنے حرارت خیز ہاتھوں میں ترازو کے اِن دو متخالف پلڑوں کو برابر رکھا، خدائے مطلق (لاد ّویت) کی شعلہ بار محبت اور مصیبت زدہ انسانیت کی طرف بے اختیار کشش۔ جو چیز انھیں اور زیادہ دلکشی بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ توازن ناممکن ہو جاتا تھا اور انھیں دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑتا تھا تو یہ دوسری چیز تھی جو بازی لے جاتی تھی۔ وہ غریب اور مصیبت زدہ انسانیت کے لئے" ترحم پر دوسری چیز کو قربان کر دیتے تھے، جیسا کہ اُن کے عظیم المرتبت بھائی بی مھودن نے کہا ہے۔

گریش کا دلکش واقعہ اس کی ایک پُر اثر مثال ہے۔ یہ یاد ہوگا کہ رام کرشن کا یہ شاگرد، مشہور بنگالی ڈراما نگار، مصنّف اور غیر معمولی اداکار تھا جس نے اُس وقت تک دُہرے کلاسکی مفہوم میں "آزاد خیالی اور عیّاشی" کی زندگی بسر کی تھی جب تک کہ گنگا کے اِس چابک دست اور روادار مچھیرے نے اُسے اپنے کانٹے میں پھنسا نہیں لیا۔ اب وہ دنیا سے بے تعلق ہوئے بغیر بڑے پکّے طور سے تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ اپنے دن مستقل بھگتی یوگ کے عقیدے کے مطابق گذار رہا تھا لیکن اُس نے اپنی آزادی تقریر سے دست کشی اختیار نہیں کی تھی اور رام کرشن کے تمام شاگرد، گرُو کی یادگار ہونے کی وجہ سے اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔

ایک دن وہ ایسے وقت آ گیا جب وویکانند ایک شاگرد سے بہت ہی دقیق فلسفیانہ مسئلہ پر بحث کر رہے تھے۔ وویکانند نے گفتگو ختم کر دی اور بہت ہی محبت آمیز ظریفانہ انداز میں کہا: "گریش! تم نے ان چیزوں کا مطالعہ کرنے کی کبھی کوئی فکر نہ کی بلکہ اپنے دن کرشن اور وشنو وں کے ساتھ گذار دیئے؟"

گریش نے جواب دیا: "نرین! مجھے ایک سوال کا جواب دو۔ تم نے تو ویدوں اور ویدانتوں کو بہت پڑھا ہے مگر کیا ان میں کہیں اُن فریادوں کا، بھوکوں کی آہ و زاری کا، قابلِ نفرت گناہوں کا اور دوسری بہت سی خرابیوں اور بُرائیوں کا، جن سے آئے دن ہم کو سابقہ پڑتا رہتا ہے، کوئی علاج تجویز کیا گیا ہے؟ گھر کی وہ ماں جو ہر روز پچاس بھوکوں کو کھانا کھلاتی تھی، آج اتنا بھی نہیں رکھتی کہ تین دن سے اپنے اور اپنے بچّوں ہی کے لئے کچھ پکا لے! بدمعاشوں نے فلاں خاندان کی ایک خاتون کی عصمت دری کی یہاں تک کہ اسی تکلیف میں وہ مر گئی! فلاں کی نوجوان بیوہ نے اپنی شرم چھپانے کے لئے اسقاطِ حمل

کی کوشش میں جان نہ دی! ...... نرن! میں تم سے پوچھتا ہوں، کہیں ویدوں میں تمھیں اِن خرابیوں کا توڑ مِلا؟ ......"

گریش اسی تیز طنزیہ انداز میں سماج کے تاریک رُخ کی تصویر کشی کرتا رہا، اور وویکانند خاموش لیکن بے حد متاثر بیٹھے سُنتے رہے۔ دُنیا کے دُکھ درد کا خیال کر کے اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، جنھیں چھپانے کے لئے وہ اُٹھ کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

گریش نے بیٹھے ہوئے شاگرد سے کہا: "تم نے دیکھا کہ تمھارے گرُو کے پاس کتنا بڑا دل ہے؟ میں اُن کی اتنی عزّت اُن کے زبردست عالم یا ذہنی دیو ہونے کی وجہ سے نہیں کرتا جتنی اُن کی اس وسعتِ قلب کی وجہ سے کرتا ہوں، جس نے انسان کی تکلیف کے خیال سے انھیں آنسو بہاتے ہوئے باہر چلے جانے پر مجبور کر دیا۔ اِسے غور سے دیکھ لو کہ جیسے ہی انھوں نے یہ باتیں سنیں، ایسا معلوم ہوا جیسے وید اور ویدانت اُن کی نگاہوں کے سامنے سے بالکل غائب ہو گئے۔ ایک لمحہ قبل وہ جو علمیت اور تبحّر دکھا رہے تھے وہ ایک طرف ڈال دیئے گئے اور اُن کا پُورا وجود محبت آمیز رحمدلی کے دُودھ سے بھر گیا اور چھلکنے لگا۔ تمھارے سوامی جی جتنے بڑے گیانی اور پنڈت ہیں اتنے ہی بڑے خدا اور انسان کے عاشق بھی ہیں۔"

وویکانند واپس آئے اور سدانند سے کہا کہ اہلِ وطن کی غریبی اور تکلیف اُن کا دل مسل رہی ہے اور انھیں اس بات پر اُکسایا کہ ایک چھوٹا ہی سا امدادی مرکز کھول کر سہی، کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ گریش کی طرف مڑ کر انھوں نے کہا: "گریش! میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اگر دُنیا کی تکالیف دُور کرنے کے لئے، نہیں بلکہ کسی ایک شخص کا معمولی سا درد مٹانے کے لئے مجھے ہزار بار جنم لینا پڑے تو میں اُسے خوشی سے قبول کروں گا...."

اُن کے رحم سے بھرے ہوئے دل کے فیاضانہ جوش وخروش نے اُن کے ساتھیوں اور شاگردوں کو بالکل اُن کے قابو میں کر دیا اور ان میں سے ہر ایک نے جیسی کہ اُنھیں ہدایت کی گئی تھی، خود کو انسانی بہبودی کے مختلف کاموں کے لئے وقف کر دیا۔

۱۸۹۷ء کے موسم گرما میں اکھنڈانند نے دو اور ساتھیوں کے ساتھ مل کر جنھیں دویکانند نے بھیج دیا تھا، چار پانچ مہینے تک ان سیکڑوں غریبوں کو کھانا کھلایا اور دیکھ بھال کی جو بنگال کے ضلع مرشد آباد میں قحط سے مر رہے تھے۔ انھوں نے لاوارث بچّوں کو جمع کر کے مہولا میں ایک یتیم خانہ قائم کیا جو بعد میں سارگاچھی میں منتقل ہو گیا۔ اکھنڈ آنند مسیحی درویش سینٹ فرانسس کے صبر وتحمل اور محبّت کے ساتھ ذات اور مذہب کی تفریق کئے بغیر ان غریب بچّوں کی تعلیم میں لگ گئے۔ ۱۸۹۹ء میں انھوں نے انھیں کپڑا بُننے، سینے پرونے، لکڑی میں جوڑ لگانے، ریشم کے کیڑے پالنے، لکھنے پڑھنے، ریاضی اور انگریزی کی تعلیم دے دی۔

۱۸۹۷ء ہی میں ترگن اتیت نے دیناج پور میں ایک مرکز قحط کے سلسلہ میں قائم کیا۔ دو مہینے میں انھوں نے چوراسی گاؤں کو قحط سے بچایا۔ دیوگھر، دکشنیشور اور کلکتہ میں بھی مرکز کھولے گئے۔

آئندہ سال اپریل، مئی ۱۸۹۸ء میں پورے رام کرشن مشن کو کلکتہ میں پھیلے ہوئے طاعون کا مقابلہ کرنے کے لئے منظّم کیا گیا۔ دویکانند اگرچہ بیمار تھے لیکن ہمالیہ سے فوراً واپس آئے کہ امدادی کام کی سربراہی کریں۔ روپیہ کی کمی تھی۔ اُن کے پاس جو کچھ تھا وہ ایک نئے مٹھ کی تعمیر کے لئے زمین خریدنے میں صرف ہو گیا تھا۔ دویکانند نے ایک لمحہ بھی تذبذب میں نہیں گذارا اور حکم دیا کہ " اگر ضروری ہو تو اُسے بیچ دو۔ ہم سنیاسی ہیں۔

ہمیں درختوں کے نیچے سو رہنے اور دن بھر میں جو کچھ ملے اُسے کھا کر جی لینے کے لئے آمادہ رہنا چاہئے۔"

ایک وسیع قطعۂ زمین کرائے پر لے لیا گیا اور اس میں حفظانِ صحت کے لئے کیمپ لگا دئے گئے۔ وویکا نند نے ایک بہت ہی نادار علاقے میں رہنا شروع کیا تاکہ لوگوں کی ہمت افزائی اور کارکنوں کی دل دہی کر سکیں۔ اس کام کا نظم و نسق سسٹر نویدیتا (مارگریٹ نوبل) کے سپرد کیا گیا جو ابھی یورپ سے آئی تھیں اور اُن کی مدد کے لئے سوامی سدآنند سوامی شیو آنند اور کچھ دوسرے معاون ساتھ کر دئے گئے۔ یہ لوگ کلکتہ کے چار خاص غریب علاقوں میں جراثیم کے مارنے اور صفائی رکھنے کے کام کی نگرانی کرتے تھے۔ وویکانند نے (اپریل ۱۸۹۹ء) طالب علموں کا ایک جلسہ کیا اور انھیں مصیبت کے وقت اُن کے فرائض یاد دلائے۔ انھوں نے خود کو گروہوں میں تقسیم کر لیا اور جا جا کر غریبوں کے گھروں کا معائنہ کیا، حفظانِ صحت کے متعلق رسالے تقسیم کئے اور مہتروں بھنگیوں کے کام انجام دینے کی مثال قائم کی۔ ہر اتوار کو وہ رام کرشن مشن کے جلسہ میں آتے اور سسٹر نویدیتا کو حالات کی رپورٹ دیتے۔

مشن نے اس مقدس رسم کی بنیاد بھی ڈالی کہ رام کرشن پرم ہنس کی سالانہ یادگار غریبوں کے ایک تیوہار کی شکل میں منائی جائے اور مشن کے تمام مرکزوں میں اس دن ہزارہا آدمیوں کو کھانا کھلایا جائے۔ اور اس طرح ہندوستان میں ہر طبقہ کے لوگوں کے درمیان برادرانہ اتحاد اور اتفاق کی ایک نئی رُوح کی بنیاد پڑی۔

امدادِ باہمی کے ان سماجی کاموں کے متوازی، تعلیم اور ویدانتی مواعظ کا سلسلہ بھی جاری رہا کیونکہ، وویکانند ہی کے الفاظ میں، وہ ہندوستان کے لئے "ایک اسلامی جسم اور ویدانتی دل" چاہتے تھے ۔ ۱۸۹۷ء میں رام کرشنانند نے، جو مدراس اور اس کے قرب و جوار

میں تقریریں کر رہے تھے، شہر کے مختلف حصّوں میں گیارہ درجے کھول، نئے تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ بھوکوں کو کھانا کھلانے کا کام بھی کر رہے تھے۔ اسی سال کے وسط میں ویویکانند نے شیوآنند کو ویدانت کی تعلیم دینے کے لئے سیلون بھیجا۔ ماہرین تعلیم میں ایک مُقدّس جوش پھیل گیا۔ ویویکانند سے بچیوں کے اسکول کی ایک ہیڈ مسٹرس نے جب یہ کہا کہ "میں اُن نوجوان بچیوں کو رُبانی ماں' (بھگوتی) کی طرح پوجتی ہوں' میں کسی اور عبادت سے واقف ہی نہیں ہوں"۔ تو اُنھیں بے حد خوشی ہوئی۔

رام کرشن مشن قائم کرنے کے فوراً ہی بعد ویویکانند اس بات پر مجبور ہو گئے کہ اپنے تمام کام روک دیں اور المورڑہ میں رہ کر کچھ ہفتہ علاج کرائیں۔ پھر بھی ۹ جولائی ۱۸۹۷ء کو یہ لکھنے کے قابل تھے کہ "تحریک شروع ہو گئی ہے اور اب یہ کبھی نہیں رُکے گی"۔

(انھوں نے کہا) "میرے دماغ میں صرف ایک ہی خیال آگ لگائے ہوئے تھا: ہندوستانی عوام کو اوپر اُٹھانے کی مشین کو چلا دینا' اور اس میں میں کسی حد تک کامیاب ہوا ہوں۔ یہ دیکھ کر تمھارا دل خوش ہو جاتا کہ میرے بچّے "قحط' وبا اور زبوں حالی میں کام کر رہے تھے' کالرے کے شکار اچھوتوں کی چٹائی کے قریب بیٹھ کر اُنکی تیمارداری کرتے اور بھوکے چنڈالوں کو کھانا کھلاتے تھے، خدا نے میری اور اُن سب کی مدد کی .... وہ جو میرا محبوب ہے' میرے ساتھ تھا، جیسے وہ امریکہ اور انگلستان میں میرے ساتھ رہا' جیسے وہ ہندوستان کی ایک جگہ سے دوسری جگہ کی یاترا میں میرے ساتھ رہا....... میرا خیال ہے کہ میرا کام پُورا ہو گیا' اب زیادہ سے زیادہ تین چار سال میری زندگی کے اور رہ گئے ہیں۔ مجھے اب اپنی نجات کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں نے کبھی دُنیوی خوشیوں کی کوئی خواہش نہیں کی۔ میں اپنی مشین کو

ٹھیک سے چلتے رہنے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کم سے کم ہندوستان میں تو میں نے یقین کے
ساتھ اُس میں انسانوں کی بھلائی کے لئے بیرم (لیور) لگا دیا ہے جسے کوئی طاقت روک
نہیں سکتی۔ اس لئے اب میں یہ فکر کئے بغیر آرام سے سوؤں گا کہ کل کیا ہوگا۔ کاش میں
بار بار پیدا ہوں اور ہزار ہا مصائب جھیلوں تاکہ میں صرف اس خدا کی پرستش کر سکوں
جو تمام روحوں کا مجموعہ ہے اور جس پر میرا عقیدہ ہے۔"

اپنی بیماری سے کم سے کم فرصت کا فائدہ اُٹھا کر انھوں نے اپنا کام دس گنا
بڑھا لیا۔ اگست سے دسمبر ۱۸۹۷ء تک میں وہ ایک آندھی کی طرح شمالی ہند میں پنجاب سے
کشمیر تک گئے اور ہر جگہ اپنا بیج ڈالتے گئے۔ کشمیر میں انھوں نے مہاراجہ سے ایک اَدوَیتی
(توحید پسند) مٹھ قائم کرنے کے امکانات پر تبادلۂ خیال کیا، لاہور کے کالجوں کے طلباء کو
خطاب کر کے اس پر زور دیا کہ خدا پر عقیدہ رکھنے کی تیاری کے لئے پہلے انسان پر
اپنے عقیدے کو مضبوط کریں اور اُن کی ایک خالص غیر فرقہ پرست انجمن بنا دی جو لوگوں
کی مدد، حفظانِ صحت اور تعلیم کی طرف متوجہ ہو۔ وہ جہاں کہیں بھی گئے اس بات کے
کہنے سے کبھی نہیں تھکے کہ ہر شخص کے اندر جو خدا ہے اس کو پانے میں مدد دے کر ہندوستانیوں
کے انفرادی کردار کو مضبوط بنانے کی کوشش کریں۔ وہ ہمیشہ ایمان اور عقیدے کو عمل
کی کسوٹی پر کستے تھے۔ سماجی ناانصافیوں کے علاج کے طور پر وہ مختلف ذاتوں اور ذاتوں
کی ذیلی ذاتوں کے درمیان بیاہ شادی کی تلقین کرتے تھے تاکہ لوگ ایک دوسرے کے
نزدیک آئیں۔ اچھوتوں کی حالت بہتر بنا کر، غیر شادی شدہ عورتوں اور ہندو بیواؤں کے
معاملہ میں دلچسپی لے کر، ہر طرح کی فرقہ پرستی، نمائشی مذہبیت، چھوت چھات کیخلاف
جہاد کر کے بھی وہ یہی مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ (اور یہ دونوں کام

ایک دوسرے کا ضمیمہ تھے) وہ سنسکرت کی صحیح تعلیم پھیلا کر ہندو ذہن کی نئی تشکیل کرنے، اس میں مغربی سائنس کا امتزاج کرنے اور ہندوستانی یونیورسٹیوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا کام بھی جاری کئے ہوئے تھے تاکہ وہ محض ڈگریاں نہ دیں اور افسر نہ پیدا کریں بلکہ انسان بنائیں۔

اُن کے ذہن میں "ہند سوراج" یا سیاسی آزادی کا کوئی خاص تصوّر نہ تھا جو انگریز کے خلاف بغاوت کی شکل میں ہو۔ وہ برطانیہ کے تعاون پر بھی اتنا ہی بھروسہ رکھتے تھے جتنا دُنیا بھر کے۔ اور حقیقت تو یہ تھی کہ انگلستان اُن کے کام میں اعانت کر رہا تھا۔ حکومت کی کوتاہی کی حالت میں اُن کے لندن اور نیویارک کے شاگرد سوامی ویویکانند کے لئے اپنی ذاتی خدمت کے علاوہ اتنا کافی سرمایہ لائے جس سے زمین خرید کر بیلور کا زبردست آشرم تعمیر کیا جا سکا۔

۱۸۹۸ء کا پورا سال خاص طور سے رام کرشن مٹھ کو نئی طرح منظّم کرنے اور ایسے اخبارات و رسائل نکالنے میں صرف ہو گیا جو مشن کے ذہنی ترجمان اور ہندوستان کی تعلیم کا ذریعہ تھیں۔

• • • • • • • •

لیکن اس سال (۱۸۹۸ء) کی خاص اہمیت تھی ویویکانند کی اپنے مغربی شاگردوں کی تعلیم و تدریس۔

وہ سب ان کی دعوت پر آئے تھے۔ مِس مارگریٹ نوبل جنوری کے آخر میں آئیں تاکہ مِس مُلر کے ساتھ مل کر ہندوستانی خواتین کی تعلیم کا ادارہ قائم کریں۔ مسز اُول بُل اور مِس جوزیفین میک لیوڈ فروری میں پہونچیں۔ مارچ میں مارگریٹ نوبل نے ہمیشہ کنواری

رہنے کا عہد کر لیا اور سسٹر نویدیتا (نارہ کی ہوئی) کا نام اختیار کیا۔ وویکانند نے کلکتہ کے عوام سے ہندوستان کو انگلستان کے عطیہ کی حیثیت سے اُن کا گرم جوش تعارف کرایا اور اس خیال سے کہ اُن کے اندر سے پُرانی یادیں، تعصبات اور اُن کے ملک کے رسم ورواج کی جڑیں بالکل ختم ہو جائیں، اُنھوں نے چند اور شاگردوں کو ساتھ لیکر تاریخی مقامات کا کئی مہینے کا دورہ کر ڈالا۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اپنے ساتھیوں کی رُوح کو اپنی قوم کی مذہبی خلیج میں پھینکتے ہوئے وہ خود بھی اس میں اس قدر کھو جاتے تھے گویا اسی میں غرق ہو گئے ہوں۔ لوگوں نے دیکھا کہ یہ زبردست توحید پرست، واحدِ مطلق کو بغیر کسی شکل اور صُورت کے پوجنے والا اساطیری دیوتاؤں اور شاہی جوڑے یعنی شیو اور کالی ماتا کے لئے بھی غیر معمولی جوشِ عقیدت کے دور سے گذر رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں وہ اپنے گرو رام کرشن کی تقلید کر رہے تھے جن کے دل میں خدائے مطلق کی بھی جگہ تھی اور تمام دوسرے دیوی دیوتاؤں کی بھی اور جنھوں نے مستقل سالہا سال تک خوبصورت دیوی کے لئے زبردست محویت کی مسرّت کا تجربہ کیا تھا۔ لیکن وویکانند کے معاملہ میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ وہ پہلے نہیں بلکہ واحدِ مطلق کو پالینے کے بعد ان کی طرف آئے اور اپنے ساتھ اپنی فطرت کا المناک جوش بھی اُن کے لئے لائے، یہاں تک کہ اُنھوں نے دیوی دیوتاؤں اور خاص کر کالی دیوی کو بالکل ایک دوسرا لباس پہنا دیا جس کا ماحول اس سے بالکل مختلف تھا جس میں رام کرشن کی مجذوبانہ بزمی نے انھیں ملبوس کیا تھا۔

کچھ دن الموڑہ میں ٹھہرنے کے بعد جہاں سیویر میاں بیوی پہلے ہی سے مقیم تھے اور جس جگہ ادویت آشرم تیار ہونے والا تھا، پھر تین ہاؤس بوٹوں میں وادی سری نگر تک

جاکر کشمیر کا سفر کرنے کے بعد، ویویکانند نے جولائی ۱۸۹۸ء میں نویدتا کے ساتھ امرناتھ کی گپھا کی یاترا کی جو مغربی ہمالیہ کی ایک برف پوش وادی میں واقع ہے۔ یہ لوگ بھی دو تین ہزار یاتریوں کے مجمع کا ایک جز تھے، جو پڑاؤ ڈالتا تھا تو خیموں کا ایک پورا شہر بس جاتا تھا۔ نویدتا نے دیکھا کہ اُن کے گرو میں ایک زبردست تبدیلی پیدا ہو رہی ہے۔ وہ اُن ہزاروں یاتریوں میں کے ایک ہو گئے اور باقاعدہ وہ چھوٹی چھوٹی رسمیں بھی ادا کرنے لگے، رواج جن کا مطالبہ کرتا تھا۔ منزلِ مقصود تک پہونچنے کے لئے اُن کے لئے ضروری تھا کہ خطرناک راستوں سے ہو کر مسلسل کئی دن تک پتھریلی ڈھلوانوں پر چڑھیں، کئی میل کی برفانی ندیاں پار کریں اور ٹھنڈک کے باوجود مقدّس چشموں میں اشنان کریں۔ دوسری اگست کو، جس دن سالانہ تیوہار پڑتا تھا وہ اُس زبردست گپھا میں پہونچے جس کے اندر ایک بہت بڑا گرجا گھر سما سکتا تھا اور جس کے پیچھے برف کا لِنگ یعنی عظیم المرتبت شیوجی خود براجمان تھے۔ ہر شخص کو جسم پر بھبھوت مل کر برہنہ اُس میں داخل ہونا پڑتا تھا۔ سب سے پیچھے جذبات سے لرزتے ہوئے ویویکانند تقریباً بیہوشی کی حالت میں داخل ہوتے اور وہاں، اس غار کی تاریکی میں، برف کی سفیدی کے سامنے، ہزارہا گاتی ہوئی آوازوں کے درمیان، سجدے میں پڑے ہوئے اُنھیں ایک بشارت ہوئی ...... انھوں نے شیو کو دیکھا۔ انھوں نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ کیا دیکھا اور کیا سُنا........ لیکن اُن کے تنے ہوئے اعصاب پر اس ظہور کا ایسا جھٹکا لگا کہ وہ تقریباً مر گئے۔ جب وہ غار سے باہر آئے تو اُنکی بائیں آنکھ میں خون کا ایک دھبّہ تھا اور اُن کا دل اِس طرح پھیل گیا کہ پھر کبھی اپنی اصلی حالت پر نہیں آیا۔ اس کے بعد کئی دن تک انھوں نے شیو کے علاوہ کسی اور کی بات نہیں کی، ہر طرف اُنھیں شیو ہی نظر آتے تھے اور وہ اُنھیں میں سرشار ہو گئے۔ برف پوش ہمالیہ کیا تھا، اپنے

تخت پر بیٹھے ہوئے شیو تھے ......

ایک مہینے بعد وہ اسی طرح کالی دیوی کے قبضہ میں آگئے۔ ربانی مادریت ہر جگہ حاضر و ناظر تھی۔ انھوں نے ان کی پرستش ایک چار سالہ لڑکی کے روپ میں بھی کی لیکن وہ ہمیشہ اسی طرح کے سکون بخش روپ میں ان کے سامنے نہیں آیا کرتی تھیں۔ اُن کے گہرے مراقبہ نے انھیں اس علامت کا بھیانک چہرہ بھی دکھایا۔ اُن پر کالی کا خوفناک کشف بھی ہوا، زندگی کی نقاب کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی زبردست تباہ کرنے والی قوت کا، زندہ انسانوں کے گذرتے ہوئے قدموں سے پیدا ہونے والی شکلوں اور اُڑائی ہوئی گرد میں چھپی ہوئی مہیب طاقت کا۔ رات کو بخار کی حالت میں انھوں نے ٹٹول کر پنسل اور کاغذ نکالا اور اپنی مشہور نظم "کالی ماتا" لکھی اور پھر تھک کر بے سدھ ہو گئے:

ستارے مِٹ گئے ہیں،
بادل کو بادل نے چھُپا رکھا ہے،
لرزتا ہوا، صاف آواز میں گاتا ہوا اندھیرا ہے۔
گونجتی اور جھکّڑ کی طرح چلنے والی ہواؤں میں
لاکھوں دیوانوں کی روحیں ——
جو ابھی قیدخانے سے آزاد کی گئی ہیں ——
درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ کر پھینک رہی ہیں،
ہر چیز کو راستے پر سے اُڑائے لئے جا رہی ہیں۔
سمندر بھی اس ہنگامہ میں شریک ہو گیا ہے

اور پہاڑوں جیسی اونچی لہریں اُٹھا رہا ہے
کہ تاریک آسمان تک پہونچ جائے۔
تیز روشنی کی چمک،
ہزارہا ہزار سائے
ہر طرف نمایاں کرتی ہے،
موت کے بدصورت اور کالے سائے
جو غم اور بیماریاں پھیلا رہے ہیں
اور خوشی سے دیوانوں کی طرح ناچتے ہیں۔
آ ماتا! آ!
تیرا نام ہی قہر ہے،
موت تیری سانس ہے
اور تیرا ہر لرزتا ہوا قدم
ایک دُنیا کو ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیتا ہے۔
تو "وقت" ہے، ہمہ تباہ کُن!
آ ماتا! آ!
جو مصیبتوں سے محبت کرتا ہے
اور موت کے پیکر کو گلے لگاتا ہے،
تباہ کاری کے رقص میں شریک ہوتا ہے
ماتا اس کے پاس آتی ہے۔

اُنھوں نے نویدیتا سے کہا: "ماتا کو بیماری، خوف، غم اور تباہی میں بھی اُسی وجہ ان سے پہچاننا سیکھو جیسے نیکی اور خوشی میں! اے ماں! احمق لوگ تمھارے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتے ہیں اور پھر خوف زدہ ہو کر تمھیں "رحمدل" کہتے ہیں!......موت پر دھیان دو، قہار کی پرستش کرو، صرف قہار کی پرستش ہی سے قہر پر قابو پایا جاسکتا ہے اور حیاتِ ابدی حاصل کی جاسکتی ہے...... اذیت میں بھی مسرت ہوسکتی ہے........ ماتا خود برہما ہیں، اُن کی بددعا بھی برکت ہے۔ دل کو ایک شمشان بن جانا چاہئے جس میں تکبر، خودغرضی، خواہش سب جل کر راکھ ہو جائیں۔ اُس وقت اور صرف اسی وقت ماتا آئینگی!"

انگریز خاتون نے اس طوفان سے متاثر اور متحیر ہو کر دیکھا کہ اس ہندوستانی صاحبِ کشف کے اُٹھائے ہوئے کائناتی طوفان کے سامنے ان کے مغربی عقائد کا سکون اور التزام غائب ہو رہا ہے۔ اُنھوں نے لکھا:

"جب وہ یہ کہہ رہے تھے تو عبادت کی وہ باطنی خودپسندی جو زلزلہ یا آتش فشاں والے خدا کے لئے نہیں بلکہ ایک رحمدل خدا، پروردگار، تسکین بخش خدا کے لئے وقف ہوتی ہے، سننے والوں پر چھا گئی اور ایسا محسوس ہوا کہ اس طرح کی عبادت، جیسا ہندو کہتے ہیں، اصل میں محض "دوکانداری" ہے اور اس تلقین کی عظیم ترجرأت کا احساس ہوا کہ خدا خود کو بیماری میں بھی اسی طرح ظاہر کرتا ہے جیسے نیکی میں۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ قوتِ ارادی اور دماغ کا صحیح رویہ، جنھیں ذاتی غرض سے متاثر نہیں ہونا چاہئے، سوامی وویکانند کے تلخ الفاظ میں یہ تھے کہ 'زندگی نہیں موت کی خواہش کرنا چاہئے، خود کو تلوار کی نوک پر گرا دینا چاہئے تاکہ ہمیشہ کے لئے اس قہار سے اتحاد حاصل ہو جائے!'"

ان کے اس دورے میں ہمیں ایک بار پھر دلیری کی قوت دکھائی دیتی ہے اور یہی

اور پہاڑوں جیسی اونچی لہریں اُٹھا رہا ہے
کہ تاریک آسمان تک پہونچ جائے۔
تیز روشنی کی چمک،
ہزار ہا ہزار سائے
ہر طرف نمایاں کرتی ہے،
موت کے بدصورت اور کالے سائے
جو غم اور بیماریاں پھیلا رہے ہیں
اور خوشی سے دیوانوں کی طرح ناچتے ہیں۔
آ ماتا! آ!
تیرا نام ہی قہر ہے،
موت تیری سانس ہے
اور تیرا ہر لرزتا ہوا قدم
ایک دُنیا کو ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیتا ہے۔
تو "وقت" ہے، ہمہ تباہ کُن!
آ ماتا! آ!
جو مصیبتوں سے محبّت کرتا ہے
اور موت کے پیکر کو گلے لگاتا ہے،
تباہ کاری کے رقص میں شریک ہوتا ہے
ماتا اس کے پاس آتی ہے۔

اُنھوں نے نویدیتا سے کہا: "ماتا کو بیماری، خوف، غم اور تباہی میں بھی اُسی وجہ ان سے پہچاننا سیکھو جیسے نیکی اور خوشی میں! اے ماں! احمق لوگ تمھارے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتے ہیں اور پھر خوف زدہ ہو کر تمھیں "رحمدل" کہتے ہیں!...... موت پر دھیان دو، قہّار کی پرستش کرو، صرف قہار کی پرستش ہی سے قہر پر قابو پایا جا سکتا ہے اور حیاتِ ابدی حاصل کی جا سکتی ہے...... اذیّت میں بھی مسرّت ہو سکتی ہے...... ماتا خود برہما ہیں، اُن کی بددعا بھی برکت ہے۔ دل کو ایک شمشان بن جانا چاہئے جس میں تکبّر، خود غرضی، خواہش سب جل کر راکھ ہو جائیں۔ اُس وقت اور صرف اسی وقت ماتا آئینگی!"

انگریز خاتون نے اس طوفان سے متاثر اور متحیّر ہو کر دیکھا کہ اس ہندوستانی صاحبِ کشف کے اُٹھائے ہوئے کائناتی طوفان کے سامنے ان کے مغربی عقائد کا سکون اور التزام غائب ہو رہا ہے۔ انھوں نے لکھا:

"جب وہ یہ کہہ رہے تھے تو عبادت کی وہ باطنی خود پسندی جو زلزلہ یا آتش فشاں والے خدا کے لئے نہیں بلکہ ایک رحمدل خدا، پروردگار، تسکین بخش خدا کے لئے وقف ہوتی ہے، سننے والوں پر چھا گئی اور ایسا محسوس ہوا کہ اس طرح کی عبادت، جیسا ہندو کہتے ہیں، اصل میں محض "دوکانداری" ہے اور اس تلقین کی عظیم ترجرأت کا احساس ہوا کہ خدا خود کو بُرائی میں بھی اسی طرح ظاہر کرتا ہے جیسے نیکی میں۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ قوّتِ ارادی اور دماغ کا صحیح رویّہ، جنھیں ذاتی غرض سے متاثّر نہیں ہونا چاہئے، سوامی وویکانند کے تلخ الفاظ میں یہ تھے کہ 'زندگی نہیں موت کی خواہش کرنا چاہئے، خود کو تلوار کی نوک پر گرا دینا چاہئے تاکہ ہمیشہ کے لئے اس قہّار سے اتّحاد حاصل ہو جائے!'"

ان کے اس دورے میں ہمیں ایک بار پھر دلیری کی قوّت دکھائی دیتی ہے اور یہی

وویکانند کے لئے عمل کی رُوح تھی۔ یہ حقیقتِ مطلق تھی جو اپنی مکمّل قہر آلود عریانی کے ساتھ نرم ہوئے بغیر ظاہر ہونا چاہتی تھی۔ عقیدہ اپنے مفت کے عطیہ کا کوئی عوض نہیں چاہتا، لین دین کے حساب اور وعدۂ جنّت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے کیونکہ اس کی ناقابلِ تخریب قوّت اس فولاد کی طرح ہے جو کچھ بننے کے لئے نہائی پر رکھکر ہتھوڑے سے پیٹا جاتا ہے۔

ہمارے بڑے بڑے عیسائی راہب اس سے واقف تھے اور اس کی زندگی بخش مسرّت کا اب بھی تجربہ کرتے ہیں۔ پاسکل نے بھی اس کی لذّت اٹھائی تھی لیکن عمل سے بے تعلق بنانے کے بجائے وویکانند نے اُسے ایسے خون کو گرم کردینے والے جوش سے محسوس کیا جس نے اُن کی قوّتِ ارادی کو فولادی بنادیا اور انھیں دس گنے جوش و خروش سے اس میں پھاند پڑنے پر آمادہ کیا۔

انھوں نے ساری دنیا کی مصیبتوں کو اپنا لیا۔ نویدتا نے لکھا ہے: "ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دُنیا میں کسی کو چوٹ لگے گرو کا دل اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا یہاں تک کہ کسی قسم کا درد، چاہے وہ موت ہی کے لئے کیوں نہ ہو، اُن سے محبّت اور برکت کے سوا اور کچھ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔"

وویکانند نے کہا: "میں نے موت کے بھرُوپ کو گلے سے لگایا ہے۔" وہ کئی مہینے اس جذبے کے زیرِ اثر رہے۔ انھیں ماتا کے سوا اور کسی کی آواز ہی نہیں سُنائی دیتی تھی اور اُن کی صحت پر اس کا زبردست اثر تھا جب وہ واپس ہوئے تو اُن کے ساتھی سنیاسی اُن میں ایسی تبدیلی دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ وہ خیالات میں اس درجہ محو رہنے لگے کہ دس بار سوال پوچھنے کے بعد بھی جواب نہ دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ

اِس کا سبب "زبردست تپسیا" (سنیاس کی آگ) ہے۔ "شیو بذاتِ خود میرے دماغ میں داخل ہو گئے ہیں۔ وہ باہر نہیں نکلیں گے!"

یورپ کے اُن عقلیت پسند دماغوں کے لئے جو شخصی خدا کے تصوّر سے اِس طرح مغلوب ہو جانے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اُس توضیح اور تشریح کو ذہن میں رکھنا مفید ہو گا جو وویکانند نے ایک سال بعد اپنے ساتھیوں کے سامنے پیش کی: "صرف انسان کی نہیں، تمام مخلوقات کی رُوحوں کا مجموعہ شخصی خدا ہے۔ اِس مجموعی قوّت کے اِرادے کو کوئی روک نہیں سکتا۔ یہی ہے جسے ہم قانون کہتے ہیں اور 'شیو'، 'کالی' وغیرہ سے ہم یہی مُراد لیتے ہیں۔"

لیکن اس عظیم المرتبت ہندوستانی کی زبردست جذبات انگیزی اُن چیزوں کو بھی آتشیں پیکر میں ڈھال لیتی تھی جو ابھی یوروپین دماغوں میں غور و فکر کی منزل میں رہتی تھیں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اَدوَیت (وحدانیت) میں اُن کا عقیدہ متزلزل نہیں ہوا۔ لیکن رام کرشن سے ایک مخالف راستہ سے ہو کر وہ بھی آفاقی آگہی کی اُسی بلندی پر افکار کے اُسی مینار پر پہونچے جہاں انسان بیک وقت دائرہ بھی ہوتا ہے اور مرکز بھی، تمام رُوحوں کا مجموعہ بھی اور انفرادی رُوح بھی ——— "اُوم" جس میں سب کی سمائی ہے اور جو ابدی آواز (ناد) میں جذب ہوتا ہے ——— یہی کبھی نہ ختم ہونے والی اُبھری حرکت کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور خاتمہ بھی۔ اس وقت سے اُن کے ساتھی سنّیاسی ان میں اور رام کرشن میں کچھ مبہم سی مشابہت دیکھنے لگے۔ پریا آنند نے ایک دفعہ اُن سے کہا بھی: "کیا آپ میں اور رام کرشن میں کچھ فرق ہے؟"

وہ بیلور کے نئے مٹھ میں واپس آ گئے اور ۹ دسمبر ۱۸۹۸ء کو اس کا مقدس افتتاح ہوا۔

اِس سے کچھ دن پہلے ۱۲ نومبر کو کالی دیوی کے تیوہار کے دن کلکتہ میں نویدیتا کا لڑکیوں کا اسکول کھولا گیا۔ بیماری اور تنفس کے گلا گھونٹ دینے والے دوروں کے باوجود حسن سے وہ چہرے کی نیلاہٹ کے ساتھ اس طرح بچ نکلے تھے جیسے کوئی ڈوبتا ہوا آدمی۔ شاردا آنند کی مدد سے وہ مشن کا کام آگے بڑھاتے رہے۔ وہاں سنسکرت، مشرق اور مغرب کے فلسفہ، ہاتھ کے کام اور مراقبہ سب کی تعلیم یکساں طور سے ہوتی تھی۔ انھوں نے خود اس کی مثال قائم کی۔ مابعد الطبیعات پر لکچر دینے کے بعد وہ باغ گوڑتے تھے، انھوں نے ایک کنواں بھی کھودا اور آٹا گوندھ کر روٹی بھی پکائی۔ وہ عمل کا ایک زندہ نغمہ تھے۔

"ایک بڑا سنیاسی ہی (اپنے وسیع ترین مفہوم میں وہ شخص جس نے واحد مطلق کی عبادت کا عہد کر لیا ہے) بڑا مزدور ہو سکتا ہے کیونکہ اُس کا کسی چیز سے تعلق نہیں ہے .... بدھ اور مسیح سے بڑے مزدور کبھی نہیں تھے ...... کوئی کام دنیوی نہیں ہے۔ ہر قسم کا کام عبادت اور پوجا ہے۔" اس کے علاوہ وہ کاموں کی قسموں میں اعلیٰ اور ادنیٰ کی کوئی ترتیب نہیں ہے۔ ہر مفید کام شریفانہ ہے ....

"اگر میرے گرو بھائی مجھ سے کہیں کہ میں اپنی باقی ماندہ زندگی مٹھ کی نالیاں صاف کرنے میں گذار دوں، تو یقیناً میں ایسا ہی کروں۔ وہی بڑا رہنما ہے جو یہ جانتا ہے کہ عوام کی بھلائی کے لیے حکم کس طرح ماننا چاہیئے ......" پہلا فرض "تیاگ" ہے۔" تیاگ کے بغیر کوئی مذہب (وہ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ "رُوح کا بنیادی اصول") قائم نہیں رہ سکتا۔"

"ویدوں میں ہے کہ جو شخص تیاگ کرتا ہے یعنی سنیاسی ہے" وہ ویدوں سے اوپر کھڑا ہے۔ کیونکہ وہ فرقوں، مندروں اور پیغمبروں سے آزاد ہے۔" وہ خدا میں بستا ہے اور خدا اُس میں، اُسے صرف یقین رکھنا چاہیئے!

"دنیا کی تاریخ اُن چند آدمیوں کی تاریخ ہے جو اپنے اوپر عقیدہ رکھتے تھے۔ وہی عقیدہ ربّانیت کو اپنے اندر طلب کر لیتا ہے۔ پھر تم جو چاہو وہ سب کر سکتے ہو۔ تمھیں ناکامی اسی وقت ہوتی ہے جب تم اپنی لامحدود قوت کو ظاہر کرنے کی پوری کوشش نہیں کرتے۔ جیسے ہی کوئی فرد یا ملک اپنے اوپر یقین کھو دیتا ہے، مر جاتا ہے پہلے اپنے اوپر ایمان؛ لاؤ پھر خدا پر۔ مُٹھی بھر مضبوط انسان دنیا کو ہلا سکتے ہیں......"

اس لئے بہادر بنو۔ بہادری سب سے بڑی خوبی ہے۔ ہمیشہ ہر شخص سے "بغیر تفریق، بغیر مفاہمت پسندی، بے خوف، لفظی ہیر پھیر کے بغیر" پوری سچی بات کہو۔ امیروں اور بڑے لوگوں سے پریشان نہ ہو۔ سنیاسی کو دولتمندوں سے کوئی غرض نہیں رکھنا چاہئے۔ اُمراء کی عزّت کرنا اور مدد کے لئے اُن کی خوشامد کرنا ایسا ہے جو صرف طوائفوں کو زیب دیتا ہے۔ سنیاسی کے فرائض غرباء سے وابستہ ہیں۔ اُسے چاہئے کہ غریبوں کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرے اور اُن کی خدمت اپنی پوری قوّت سے کرے۔

"اگر تم اپنی نجات کے طلبگار ہو تو تم دوزخ میں جاؤ گے۔ تمھیں دوسروں کی نجات کی فکر کرنا چاہئے......(اور اگر دوسروں کی خدمت کرتے ہوئے تمھیں دوزخ میں بھی جانا پڑے تو یہ اس سے بہت بہتر ہے کہ تم اپنی نجات کی فکر میں جنّت میں جاؤ۔ سری رام کرشن دنیا میں آئے اور انھوں نے دنیا والوں کے لئے جان دی۔ میں بھی اپنی زندگی قربان کر دوں گا، تم بھی، اور ہر شخص کو یہی کرنا چاہئے۔ یہ سارے کام ابھی تو محض ابتدائی ہیں۔ یقین کرو۔ ہمارے خونِ حیات بہانے سے خدا کے بہادر، مضبوط اور دلیر فرزند پیدا ہوں گے اور دنیا میں انقلاب لائیں گے۔"

ان کے الفاظ گیت ہیں، بِی تھوون کے طرز کے جلیے اور ہنڈل کے کورسوں کی رفتار

کی طرح پرجوش نغمے۔ میں اُن کے ان اقوال کو جو کتابوں کے صفحات میں تیس سال پر محیط ہیں، اپنے بدن میں بجلی کے لمس سے پیدا ہونے والے جھٹکے محسوس کئے بغیر نہیں لکھ سکتا۔ جب یہ اس شورہ ما کی زبان سے شعلہ بار الفاظ کی شکل میں ادا ہوئے ہوں گے تو اُن میں کیسا اُبھار رہا ہوگا!

وہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ مرنے والے ہیں لیکن "زندگی ایک پیکار ہے، مجھے لڑتے ہوئے مرنا چاہیئے۔ دو سال کی جسمانی تکلیفوں نے مجھ سے میری زندگی کے بیس سال چھین لئے لیکن رُوح ناقابلِ تغیر ہے۔ وہ ہر وقت ہے، ویسی ہی نادان، صرف ایک خیال لئے ہوئے...... آتما......"
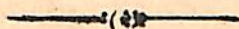
مغرب کا دُوسرا سفر

دوِیکانند مغرب کے دوسرے سفر پر اس لئے روانہ ہو گئے کہ جس کام کی انھوں نے وہاں بنیاد ڈالی تھی اُس کا جائزہ لیں اور شعلے کو اور بھڑکائیں۔ اس بار وہ اپنے ساتھ ایک بہت ہی عالم و فاضل ساتھی تُریانند کو لے گئے جو اعلیٰ ذات کے تھے اور اعلیٰ زندگی کے حامل تھے۔ انھوں نے کہا: "پچھلی دفعہ انھوں نے ایک سپاہی دیکھا، اب میں انھیں ایک برہمن دکھانا چاہتا ہوں۔"

"اس دفعہ اپنی پچھلی واپسی کے مقابلہ میں وہ بالکل دوسرے ہی حالات میں وہاں گئے۔ اپنے گھُلے ہوئے جسم میں وہ قوّت کا معمار چھُپا کر لے گئے، اُن کی سانسوں سے عمل اور پیکار کے شعلے نکل رہے تھے۔ اپنی بے رُوح قوم کی مُردہ دلی سے وہ اس قدر برگشتہ خاطر تھے کہ کارسیکا کے قریب پہونچ کر اُنھوں نے جہاز ہی میں جنگ کے سورما (نیپولین) کی یاد میں ایک جشن منایا۔"

اخلاقی بزدلی سے نفرت کرنے میں وہ اسقدر آگے نکل گئے کہ جُرم کی قوّت کو بھی ترجیح دینے لگے۔ جتنی اُن کی عمر بڑھتی جاتی تھی اس بات پر اُن کا یقین بھی بڑھتا جاتا تھا کہ مشرق اور مغرب کو ایک دوسرے کی اعانت کرنا چاہیے۔ انھیں ہندوستان اور

یورپ میں" دو نامیاتی جسم پورے شباب پر دکھائی دیتے تھے......... دو بڑے تجربے جن میں سے کسی کی بھی تکمیل نہیں ہوئی تھی۔" انھیں ایک دوسرے کا مددگار بننا چاہیے لیکن ابھی دونوں عمر کی ایک صبر آزما منزل میں تھے۔ انھیں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر آگے بڑھنا چاہیے۔ جب ڈیڑھ سال بعد وہ ہندوستان لوٹے تو تقریباً زندگی سے بالکل بے تعلق ہو چکے تھے اور مغربی سامراج نے نقاب ہٹا کر انھیں اپنا جو ظالمانہ چہرہ دکھایا تھا اُس نے اُن کے اندر سے ساری تشدد پسندی کو باہر نکال پھینکا تھا۔ انھوں نے اس کی آنکھوں کے اندر جھانک کر دیکھا تھا جو غارت گرانہ نفرت سے بھری ہوئی تھیں۔ انھیں احساس ہو گیا کہ پہلے سفر میں وہ یورپ اور امریکہ کی قوت، تنظیم اور جمہوریت کے ظاہری رکھ رکھاؤ سے متاثر ہو گئے تھے۔ اس دفعہ انھیں ان کی حرص پسندی، لالچ اور دولت پرستی کے ساتھ اقتدار حاصل کرنے کی خوفناک جدوجہد کا پتہ چلا۔ اُن میں اس کی صلاحیت تھی کہ اُنکی زبردست تنظیم کو خراجِ عقیدت پیش کر سکیں......

"لیکن بھیڑیوں کے ایک غول میں کیا خوبصورتی ہو سکتی ہے؟" اُن کے ایک شاہدِ عینی کا بیان ہے کہ "مغربی زندگی انھیں جہنم معلوم ہوتی تھی......"

مادی چمک دمک اب انھیں بالکل دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ جو قوت زبردستی صرف کی جا رہی تھی اُس کے نیچے انھیں تھکن اور المناکی اور تنگ ظرفی کی نقاب کے اندر چھپا ہوا زبردست غم کا صاف اندازہ تھا۔ انھوں نے نویدتا سے کہا "مغرب کی سماجی زندگی قہقہہ کی ایک گونج ہے لیکن اس کی تہہ میں نالہ و شیون ہے۔ اس کا خاتمہ سسکیوں پر ہوتا ہے۔ ساری خوشیاں اور اچھل کود صرف سطح پر ہیں، درحقیقت یہ غم والم کی شدت سے

بوجھل ہیں...... یہاں (ہندوستان میں) سطح پر غم اور تاریکی ہے لیکن ان کے نیچے بے پروائی اور خوشیاں ہیں۔"

یہ پیمبرانہ نگاہ انھیں کہاں سے مل گئی تھی؟ اُن کی نظروں نے کب اور کس طرح درخت سے چھال ہٹا کر ظاہری شان و شکوہ کے باوجود اس روگ کو دیکھ لیا تھا جو اُسے گھُن کی طرح کھائے جا رہا تھا اور نفرت اور بے چینی کے آنے والے دنوں اور جنگوں اور انقلابوں کے زمانوں کی پیشگوئی کر دی تھی؟ اسے کوئی نہیں جانتا۔ اُن کے سفر کی سرگذشت بہت بے ترتیب انداز میں مرتب ہوتی رہی۔ اس دفعہ اُن کے ہمراہ کوئی گُڈوِن نہیں تھا۔ دو ایک نجی خطوں کے علاوہ، جن میں سب سے زیادہ دلچسپ آلمیڈا سے لکھا ہوا مِس میک لیوڈ کے نام کا خط ہے، ہمیں افسوس ہے کہ اُن کے ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے اور مشن کی کامیابی کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہے۔

صرف لندن میں ٹھہرتے ہوئے وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ پہونچ گئے جہاں تقریباً ایک سال قیام رہا۔ وہاں انھیں ابھیدانند ملے جن کا ویدانت کے سلسلہ کا کام زوروں پر چل رہا تھا۔ انھوں نے نیو یارک کے قریب ماں کلیر میں تُریانند کو متعین کر دیا اور خود سین فرانسسکو، اوک لینڈ اور آلمیڈا میں انھوں نے نئے ویدانتی مرکز بھی قائم کئے۔ سانٹا کلارا میں انھیں ساٹھ ایکڑ کا جنگلی علاقہ بھی نذر میں ملا، جہاں آشرم بن گیا اور تُریانند طلباء کے ایک منتخب گروہ کو خانقاہی زندگی کی تعلیم بھی دینے لگے۔ نویدتا نے بھی جو یہاں آکر اُن کے ساتھ ہوگئی تھیں نیو یارک میں ہندو عورت کے آدرشوں اور ہندوستان کے قدیم فنونِ لطیفہ پر تقریریں کیں۔ رام کرشن پرم ہنس کی یہ مختصر سی جماعت بڑی با عمل تھی۔ کام بڑھتا رہا اور خیالات کی اشاعت ہوتی رہی۔

لیکن اس کے لیڈروں میں سے تین چوتھائی کا تعلق اس دُنیا سے نہیں رہ گیا تھا...... شاہ بلوط کے گرد وبیش سائے اُبھر رہے تھے .... یہ سائے تھے یا کسی اور روشنی کا عکس ؟ یہ اب ہمارے سورج تو تھے نہیں......

"میرے لئے دعا کرو کہ میرا کام ہمیشہ کے لئے رُک جائے اور میری ساری رُوح ماتا میں جذب ہو جائے ...... دماغی حیثیت سے میں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک۔ میں رُوح کے سکون کو جسم کے سکون سے زیادہ محسوس کرتا ہوں۔ لڑائیاں ہاری اور جیتی جاتی ہیں! میں نے اپنا سامان باندھ لیا ہے اور عظیم المرتبت نجات دہندہ کا انتظار کر رہا ہوں۔ شیو! اے شیو! میری کشتی کو دوسرے کنارے پر لگا دو!... میں وہی کمسن لڑکا ہوں جو دکشینیشور کے برگد کے نیچے رام کرشن کی عجیب وغریب باتیں محوِ حیرت ہو کر سُنتا تھا۔ وہی میری اصل فطرت ہے۔ کام اور عمل، کچھ نیکیاں کرنا اور ایسی ہی کچھ دوسری باتیں صرف اُوپر سے لدی ہوتی ہیں...... اب میں پھر اُن کی آواز سن رہا ہوں، وہی پُرانی آواز جو میری رُوح میں اہتزاز پیدا کرتی ہے۔ رشتے ٹوٹ رہے ہیں، محبت مر رہی ہے، کام بے مزا ہو گیا ہے اور زندگی کی رونق غائب ہو گئی ہے۔ اب صرف گرو کی آواز بُلا رہی ہے ...... "مُردوں کو اپنے مُردے دفن کرنے دو، تم میرے پیچھے آؤ"...... "میرے محبوب آقا! میں آ رہا ہوں، آ رہا ہوں!" نروان میرے سامنے ہے، وہی شانتی کا سمندر، جس میں نہ لہریں ہیں نہ سانسیں...... میں خوش ہوں کہ میرا وجود ہوا، خوش ہوں کہ میں نے اذیتیں اٹھائیں، خوش ہوں کہ میں بڑی بڑی غلطیاں کرتا ہوں، خوش ہوں کہ سکون کی منزل میں داخل ہو رہا ہوں۔ میں کسی کو گرفتار چھوڑ کر نہیں جا رہا ہوں...... وہ بزرگ انسان

ہمیشہ کے لیے چلا گیا، وہ جو ہادی تھا، گرُو تھا، رہنما تھا، وہ چلا گیا......"

کیلی فورنیا کے دلکش موسم، چمکتی ہوئی دھوپ اور سبزہ زاروں میں اُن کی مضبوط قوّتِ ارادی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، اُن کا تھکا ہوا وجود ایک خواب میں غرق ہو گیا اور جسم و رُوح دونوں آزادی سے بہہ نکلے........

"میں اپنے ہاتھ یا پاؤں کی جنبش سے ہلکی سی آواز بھی پیدا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں اس حیرت خیز سکوت کا طلسم ٹوٹ نہ جائے جو یقین دلاتا ہے کہ یہ سب مایا ہے! میرے کام کے پیچھے حوصلہ تھا، محبّت کے پیچھے شخصیت، میری پاکیزگی کے پیچھے خوف تھا اور رہنمائی کے پیچھے اقتدار کی پیاس! اب یہ سب غائب ہو رہے ہیں اور میں بہہ رہا ہوں .... میں آ رہا ہوں ماتا! میں تمھاری گرم آغوش میں آ رہا ہوں، بہتا ہوا آ رہا ہوں۔ تم بے آواز، انوکھی اور عجیب سرزمین میں مجھے جہاں چاہو لے جاؤ۔ اب میں اداکار نہیں صرف تماشائی ہوں، اوہ کیسی شانتی ہے! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیالات کہیں دُور سے، بہت دُور سے میرے دل کے اندر اُتر رہے ہیں، وہ دُور کی دھیمی سرگوشیوں کی طرح ہیں اور ہر چیز پر سکون چھایا ہوا ہے، خوشگوار سکون، وہ سکون جو نیند آنے سے ذرا دیر پہلے محسوس ہوتا ہے، جب چیزیں محض سائے کی طرح دکھائی دیتی ہیں، نہ خوف ہوتا ہے نہ محبّت نہ کوئی جذبہ .... میرے آقا! میں آ رہا ہوں۔ دنیا کا وجود ہے لیکن وہ نہ خوبصورت ہے نہ بدصورت، بلکہ کوئی جذبہ پیدا کرنے سے عاری احساس کی طرح ہے۔ اس کی برکت کا کیا کہنا! تمام چیزیں حسین اور خوشگوار ہیں کیونکہ وہ میرے لئے اپنے اضافی تناسبات کھو رہی ہیں، ان میں سب سے پہلے میرا جسم ہے، اُوم، وجودِ کلی!"

اپنی پہلی حرکت کے زور میں تیر اب بھی پرواز کر رہا تھا لیکن اب وہ راستہ کے اس خاتمہ پر پہونچ رہا تھا جہاں اُسے معلوم تھا کہ زمین پر گر جائے گا....... یہ لمحہ کتنا خوشگوار تھا، "نیند آنے سے پہلے کا لمحہ" "ہبوط کا لمحہ" جب مستقبل کی وہ اذیت ناک خواہش جو کھینچے لئے پھرتی ہے، ختم ہوتی ہے اور تیر کمان اور نشانہ دونوں سے آزاد ہوا میں تیرتا ہوتا ہے.......

وویکانند کا تیر اب اپنی قوتِ حرکت ختم کر رہا تھا۔ انھوں نے ۲۰ جولائی ۱۹۰۰ء کو سمندر پار کیا اور پیرس پہونچے جہاں انھیں تاریخ مذاہب کی کانگریس میں مدعو کیا گیا تھا جو عالمی نمائش کے موقعہ پر منعقد کی گئی تھی۔ یہ شکاگو کا مذہبی اجتماع (پارلیمنٹ آف رلیجنس) نہ تھا۔ کیتھولک حکومت اس کی اجازت ہی نہیں دے سکتی تھی، یہ خالص تاریخی اور علمی کانگریس تھی۔ وویکانند کی زندگی دُنیا سے آزاد ہونے کی جس منزل پر پہونچ چکی تھی اس میں ان کی پوری شخصیت اور واقعی دلچسپی کے لئے نہیں لیکن دماغی دلچسپی کے لئے کوئی غذا نہ تھی۔ کانگریس کی کمیٹی نے اُن کے ذمّہ یہ کام کیا تھا کہ وہ ویدک مذہب کے فطرت پرستی سے ماخوذ ہونے یا نہ ہونے کی بحث کریں۔ انھوں نے آپرٹ سے مباحثہ کیا اور ہندو اور بدھ مذہب کی بنیاد کی حیثیت سے ویدوں پر تقریر کی۔ انھوں نے بدھ مت کے مقابلہ میں گیتا اور کرشن کی اوّلیت پر زور دیا اور ہندوستان کے ناٹک، فنونِ لطیفہ اور سائنس پر یونانی اثرات کے نظریہ کو رد کیا۔

لیکن اُن کا زیادہ وقت فرانسیسی تہذیب کے مطالعہ میں گذرا۔ وہ پیرس کی ذہنی اور سماجی اہمیت سے بہت متاثر ہوئے۔ ہندوستان کے لئے ایک مضمون لکھتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "پیرس یوروپی تہذیب کا مرکز اور منبع ہے" یہیں مغرب کی اخلاقیات

اور سماج کی تشکیل ہوئی۔ یہاں کی یونیورسٹی نے تمام دوسری یونیورسٹیوں کے لئے نمونہ کا کام دیا۔ پیرس آزادی کا گھر ہے اور اس نے یورپ میں نئی زندگی کی رُوح پھونکی ہے۔"

انھوں نے کچھ وقت لیتون میں بھی اپنی دوست مسز اوُل ئبل اور مسٹر نوید تا کے ساتھ گذارا۔ سینٹ مائکل کے دن وہ ماں سینٹ مائکل پر بھی گئے۔ انھیں ہندو اور رومن کیتھولک مذہبوں کی باہمی مماثلت پر اور زیادہ یقین ہوتا گیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ یورپ کی مختلف قوموں میں مختلف مدارج تک ایشیائی خون کی آمیزش ہے۔ یہ خیال تو دُور رہا کہ یورپ اور ایشیا میں کچھ فطری بنیادی اختلافات ہیں، انھیں اِس بات پر یقین تھا کہ ان دونوں کے گہرے رابطہ سے یورپ میں ایک نیا نشاۃ الثانیہ ہوگا کیونکہ اس طرح مشرق سے اُسے رُوحانی تصوّرات کا نیا حیات بخش ذخیرہ ہاتھ آجائے گا۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ جب مغرب کی اخلاقی زندگی کا ایسا تیز فہم شاہد پیرس میں فرانس کے ذہن کی تحقیق کر رہا تھا اس وقت اُسے صرف نادر ہیاسنتھے اور ترولس بوائے جیسے راہ دکھانے والے ہاتھ لگے۔

انھوں نے ۲۴ اکتوبر کو وِئینا اور قسطنطنیہ ہوکر مشرق کی راہ اختیار کی لیکن پیرس کے بعد کسی اور شہر سے انھیں دلچسپی نہیں پیدا ہوئی۔ جب وہ آسٹریا سے گذر رہے تھے تو انھوں نے وہاں کے متعلق ایک فکر انگیز جملہ استعمال کیا۔ انھوں نے کہا کہ "اگر ترکی مردِ بیمار تھا تو یہ یورپ کی بیمار عورت ہے۔" یورپ نے انھیں متنفّر بھی کر دیا تھا اور تھکا بھی دیا تھا۔ انھیں وہاں سے جنگ کی بُو آرہی تھی۔ اس کی ناگوار مہک ہر طرف پھیل رہی تھی، انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ "یورپ ایک وسیع فوجی چھاؤنی ہے۔"

اگرچہ وہ وہاں کے صوفی فقرا سے بات چیت کرنے کے لئے باسفورس میں بھی رُکے، پھر ایتھنس اور الیوسس کی یادگاریں دیکھنے کے لئے یونان بھی گئے اور آخر میں قاہرہ کے عجائب خانہ کا بھی معائنہ کیا لیکن وہ ظاہری چیزوں کے تماشے سے دُور بلکہ دُور تر ہوتے جا رہے تھے اور مراقبہ میں مستغرق رہتے تھے۔ نویدتا کا بیان ہے کہ مغربی سفر کے آخری چند مہینوں میں تو کبھی کبھی ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس سے بالکل ہی بے تعلق ہو گئے ہیں۔ اُن کی روح وسیع تر اُفق کی جانب پرواز کر رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصر میں وہ اپنے تجربات کے آخری ورق پلٹ رہے ہیں۔

یکایک اُنھیں واپسی کی تحکمانہ آواز سُنائی دی۔ ایک دن کا بھی انتظار کئے بغیر اُنھوں نے پہلا اسٹیمر پکڑا اور تنہا ہندوستان واپس آئے۔ وہ اپنا جسم چتا کے لئے واپس لاتے تھے۔

———:(٭):———

کوُچ

اُن کا قدیم اور وفاشعار دوست ابھی رخصت ہوا تھا۔ ۲۸ اکتوبر کو مسٹر سیویر نے ہمالیہ میں جو آشرم بنایا تھا اُسی میں انتقال کیا۔ وویکانند نے پہونچتے ہی یہ خبر سُنی لیکن اس کی پیش اندیشگی انھیں سفر کے دوران ہی میں ہوگئی تھی۔ بیلور میں آرام کے لئے ٹھہرے بغیر انھوں نے مایاوتی تار دیا کہ وہ آشرم آرہے ہیں۔ اِس موسم میں وویکانند کی سی صحت رکھنے والے کے لئے ہمالیہ تک پہونچنا دشوار اور خطرناک تھا۔ چار دن تک برف میں چلنا ضروری تھا اور اس سال سردی بھی خاص طور سے زیادہ تھی۔ قُلیوں اور مزدوروں کا انتظار کئے بغیر وہ اپنے دو سنیاسی ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوگئے، راستہ میں آشرم سے بھیجی ہوئی ایک جماعت اُن کے ساتھ ہولی لیکن برف باری، کُہر اور بادلوں میں وہ مشکل سے چل بھی پاتے تھے، اُن کی سانس رُکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اُن کے پریشان ساتھی بڑی مشکل سے انھیں مایاوتی آشرم تک لے گئے۔ وہاں وہ ۳ جنوری سنہ ۱۹۰۱ء کو پہونچے اور مسز سیویر سے وہ دوبارہ مِل کر خوشی اور جوش کے مِلے جُلے جذبات، کام کے مکمّل ہونے کے اطمینان اور پہاڑوں میں استادہ خوبصورت آشرم

کے خیال سے مسرور ہونے کے باوجود، وہ وہاں صرف دو ہفتے ٹھہر سکے۔ تنفس سے اُن کی سانس رُک رہی تھی اور ذراسی محنت بھی انھیں تھکا دیتی تھی۔ انھوں نے کہا: "میرا جسم ختم ہو چکا ہے" اور ۱۳ جنوری کو انھوں نے اپنی اڑتیسویں سال گرہ منائی پھر بھی اُن کی رُوح پُر حیات تھی۔ اس اَدویت آشرم میں جو اُن کی خواہش کے مطابق خدائے مطلق کے لئے وقف کر دیا گیا تھا، انھوں نے دیکھا کہ ایک ہال رام کرشن پرم ہنس کی عبادت کے لئے بھی وقف ہے۔ رام کرشن کا یہ پُر جوش شاگرد، جس نے اپنی زندگی کے اُن آخری دنوں سے زیادہ کبھی اپنے گرُو کے لئے جذبۂ پرستش کا اظہار نہیں کیا تھا، اس پر بہت خفا ہوا۔ اُن کے خیال میں یہ اس مقام کی بے حرمتی تھی۔ انھوں نے اپنے پیروؤں کو پُر جوش انداز میں متنبہ کیا کہ اس عبادت گاہ میں جو اعلیٰ ترین رُوحانی وحدانیت کے لئے وقف ہے کسی قسم کی ثنویتی مذہبی کمزوری کو جڑ پکڑنے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔

جو جذبہ انھیں کھینچ کر یہاں لایا تھا وہی انھیں واپس لے گیا۔ کوئی چیز انھیں روک نہ سکی۔ وہ ۱۸ جنوری کو مایاوتی سے رخصت ہوئے۔ چار دن پھسلنے والی ڈھلوانوں پر چلتے رہے جن میں کچھ برف پوش بھی تھیں اور اس طرح ۲۴ جنوری کو اپنے بیلور کے مٹھ میں داخل ہوئے۔

ایک آخری یاترا کے علاوہ جو انھوں نے اپنی ماں کے ساتھ مشرقی بنگال اور آسام میں ڈھاکہ اور شیلانگ کے تیرتھوں کی زیارت کے لئے کی اور جس سے وہ بالکل تھکے ہوئے واپس آئے، وہ بیلور سے صرف ایک بار وارانسی میں ایک مختصر قیام کے لئے سنہ ۱۹۰۲ء کے شروع مہینوں میں نکلے۔ اب اُن کی زندگی کا عظیم سفر ختم ہو گیا تھا.....

انھوں نے فخریہ کہا: "اس میں بات ہی کیلہ ہے۔ میں نے پندرہ سو سال کے لئے بہت کچھ کر دیا ہے!"

• • • • • •

بیلور کے مٹھ میں انھوں نے پہلی منزل پر ایک ہوادار کمرہ اپنے لئے منتخب کر لیا تھا جس میں تین دروازے اور چار کھڑکیاں تھیں۔

"سامنے عظیم ندی (گنگا) چمکیلی دھوپ میں رقص کر رہی ہے، صرف کبھی کبھی مال سے لدی ہوئی کشتی اپنے پتواروں کے چھپاکے سے فضا کی خاموشی کو توڑتی ہوئی گذر جاتی ہے...... ہر چیز سبز اور سنہری ہے اور گھاس مخمل کا فرش معلوم ہوتی ہے۔"

وہ دیہاتی زندگی بسر کر رہے تھے، فرانسسکن درویشوں کی سی پاک دیہاتی زندگی۔ وہ باغ اور اصطبل میں کام کرتے تھے۔ شکنتلا ناٹک کے راہبوں کی طرح وہ بھی اپنے پالتو جانوروں میں گھرے رہتے تھے۔ ان میں ایک کتا باگھ، بکری ہنسنی، اس کا بچہ مٹرو جس کے گلے میں چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں پڑی ہوتی تھیں اور جس کے ساتھ وہ بچوں کی طرح کھیلتے تھے، ایک ہرن، ایک سارس، بطیں اور ہنس، گائیں اور بھیڑیں سب شامل تھے۔

وہ عالم وجد میں، اپنی خوبصورت، گہری، اور لطیف آواز میں گاتے یا اُن خاص الفاظ کا ورد کرتے ہوئے جو انھیں مسحور کرتے تھے، وقت کے گذارنے کا خیال کئے بغیر ٹہلا کرتے تھے۔

لیکن اپنی تکالیف کے باوجود وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ایک بڑے رہنما کی حیثیت سے مٹھ کی نگرانی جو کسی کے ساتھ کس طرح کی جائے۔ اپنی موت تک تقریباً ہر روز وہ نو آموز لی

کو مراقبہ کے ویدانتی طریقوں کا سبق دیتے رہے۔ وہ کارکنوں میں اپنے اوپر مضبوط عقیدہ رکھنے کا جوش دلاتے، پاک اور منظم رہنے پر خاص طور سے زور دیتے، ہفتہ وار تقسیم عمل کا خاکہ تیار کرتے اور اس کی دیکھ بھال کرتے رہتے کہ ہر روز کا کام پابندی سے ہو رہا ہے یا نہیں، اُن کی نگاہوں سے کوئی تساہلی بچ کر نہیں جا سکتی تھی۔ اپنے گرد و پیش وہ ایک مجاہدانہ ماحول رکھتے تھے، رُوح کے لئے ایک "آتشیں جھاڑی" (حضرت موسیٰ کی جلوہ گاہ کی طرف اشارہ) جس کے درمیان خدا ہر وقت حاضر و ناظر رہتا ہے۔ ایک بار جب وہ صحن کے بیچ میں ایک درخت کے نیچے کھڑے ہوئے تھے انھوں نے اپنے شاگردوں کو عبادت کے لئے جاتے ہوئے دیکھ کر کہا: "تم برمھ کو ڈھونڈھنے کہاں جا رہے ہو؟......... وہ ہر وجود میں ظاہر ہے۔ یہیں، اسی جگہ برمھ موجود ہے۔ ان لوگوں کے لئے شرم کی بات ہے جو ظاہری خدا کو چھوڑ کر اپنا ذہن دوسری چیزوں پر لگاتے ہیں۔ تمھارے سامنے ہی برمھ اس طرح موجود ہے جیسے ہاتھ میں ایک پھل کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے ہو؟ برمھ یہیں ہے، یہیں، یہیں !........"

ان کے یہ الفاظ ایسے زوردار تھے کہ ان میں سے ہر ایک کو جھٹکا سا محسوس ہوا اور تقریباً پندرہ منٹ تک وہ لوگ اپنی جگہ پر اس طرح جمے کھڑے رہ گئے جیسے پتھر کے ہو گئے ہوں۔ آخر وویکانند کو اُن سے یہ کہنا پڑا: "اچھا اب عبادت کے لئے جاؤ!"

لیکن ان کی بیماری بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ذیابیطس نے استسقا کی شکل اختیار کر لی۔ پیروں پر ورم آ گیا اور جسم کے بعض حصے بیحد حسّاس اور نازک ہو گئے۔ انھیں نیند مشکل ہی سے آتی تھی۔ ڈاکٹروں نے ہر طرح کی محنت بند کر دینی چاہی اور انھیں بڑے تکلیف دہ

عمل پر مجبور کیا، پانی پینے کو بالکل منع کر دیا گیا جسے انھوں نے زاہدانہ صبر کے ساتھ تسلیم کر لیا۔ اکیس دن تک انھوں نے منھ صاف کرتے ہوئے بھی ایک قطرہ پانی حلق سے نیچے نہیں اُتارا۔ انھوں نے کہا: "جسم دماغ کا محض ایک پردہ ہے۔ دماغ جو حکم دیگا جسم اس کے بجالانے پر مجبور ہے۔ اب میں پانی کے متعلق سوچتا بھی نہیں ہوں، مجھے اس کی کمی بالکل محسوس نہیں ہوتی...... میں سمجھتا ہوں کہ میں (اس کے بغیر) سب کچھ کر سکتا ہوں۔"

سربراہ کی بیماری کے باوجود مٹھ کے کاموں اور جشنوں میں کوئی خلل نہیں پڑا۔ ان کی خواہش تھی کہ تقریبیں اپنے سارے مراسم کے ساتھ شان سے منائی جائیں کیونکہ اُن کا آزاد ذہن، جو سماجی اصلاح کے معاملہ میں کسی قسم کی بہتان طرازی کی طرف دھیان بھی نہیں دیتا تھا، خوبصورت رسموں کے شاعرانہ حسن کے لئے دل میں ایک لطیف جگہ رکھتا تھا، ان کا خیال تھا کہ یہ سیدھے سادے عقیدت مندوں کے دل میں اپنے زندہ عقیدہ سے رشتہ قائم رکھنے میں مدد دیتی ہیں چاہے کٹر ذہنیت رکھنے والے اسکی کتنی ہی عیب جوئی کریں۔

اس لئے اکتوبر ۱۹۰۱ء میں درگا پوجا کا عظیم الشان تیوہار ــــــ کالی ماتا کی پوجا کا تیوہار ــــــ جو بنگال کا قومی تیوہار بھی ہے اور جو ہمارے کرسمس سے ملتا جلتا ہے، مہکتی ہوئی خو-ان میں دھوم سے منایا گیا، اس تیوہار میں لوگوں میں مصالحت ہوجاتی ہے اور تحفوں کی لین دین ہوتی ہے اور مٹھ میں تین دن تک سیکڑوں غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ فروری ۱۹۰۲ء میں رام کرشن کی تقریب میں کوئی تیس ہزار سے زیادہ یاتری بیلور میں آگئے لیکن سوامی کو بخار تھا اور پیروں کے ورم کی وجہ سے وہ اپنے کمرے ہی میں

صاحب فراش تھے۔ انھوں نے کمرے کی کھڑکی ہی سے رقص اور سنکیرتن دیکھے اور جو چیلا ان کی تیمارداری کرتے ہوئے رو رہا تھا اُسے تسلّی دی۔ اپنی یادوں کی تنہائی میں انھوں نے پھر وہ دن گذارے جو گرو کے ساتھ دکشنیشور میں پہلے گذار چکے تھے۔

ابھی اُن کے لئے ایک بڑی خوشی باقی تھی۔ ایک نامور جہان اوکاکورا اُن سے ملنے کے لئے آئے۔ وہ جاپان کی بودھی خانقاہ کے نگراں اوڈا کے ساتھ آئے تھے تاکہ انھیں مذاہب کی دوسری کانگریس کے لئے مدعو کریں۔ یہ ملاقات بیحد پُراثر تھی۔ دونوں نے اپنے روحانی رشتہ کی تصدیق کی۔

ووِیکانند نے کہا: "ہم دو بھائی ہیں جو دنیا کے دو کناروں سے آکر پھر مِل رہے ہیں۔"

اوکاکورا نے ووِیکانند سے منت سماجت کی کہ وہ اُن کے ہمراہ مشہور تیرتھ بودھ گیا تک چلیں اور ووِیکانند نے کئی ہفتوں کے آرام کا فائدہ اٹھا کر اُن کی دعوت منظور کر لی اور آخری بار وارانسی گئے۔

● ● ● ● ● ●

زندگی کے آخری برسوں میں اُن کی بات چیت، تجاویز اور خواہشات کو اُن کے شاگردوں نے پوری دیانت داری سے اکٹھا کر لیا ہے۔ وہ ہمیشہ ہندوستان کے دوبارہ زندہ ہونے کے خیالات میں مستغرق رہتے تھے اور وہ تجویزیں جو اُن کے دل سے لگی ہوئی تھیں یہ تھیں کہ کلکتہ میں ایک ویدک کالج قائم کیا جائے جہاں نامور علماء قدیم ہندوستانی تہذیب اور سنسکرت کی تعلیم دیں اور عورتوں کے لئے ایک مٹھ بنایا جائے جو بیلور کے مٹھ کی طرح گنگا کے کنارے "مقدس ماتا" (رام کرشن پرم ہنس کی بیوہ) کی نگرانی

میں کام کرے۔

لیکن اُن کی سچی رُوحانی وصیتیں، دِل سے نکلی ہوئی اُن حسین پُراعتماد باتوں میں ملیں گی جو انھوں نے ایک دن چند سنتھال مزدوروں سے کیں۔ وہ غریب لوگ تھے اور مٹھ کے قریب زمین کھودنے پر لگائے گئے تھے۔ وویکانند انھیں دل سے چاہتے تھے۔ وہ اُن کے ساتھ گھُل مِل گئے، اُن سے باتیں کیں، انھیں باتیں کرنے کا موقع دیا اور اُن کے چھوٹے چھوٹے دکھوں کی داستان سُن کر ہمدردی میں روئے۔ ایک دن انھوں نے اُن کی دعوت کا انتظام کیا: "تم لوگ نارائن ہو۔ آج میں نے خود نارائن کی دعوت کی ہے......"

اس کے بعد وہ اپنے شاگردوں کی طرف مڑ کر بولے: "دیکھو یہ غریب اَن پڑھ لوگ کتنے سادہ دل ہیں! کیا تم لوگ ان کی مصیبتیں کسی حد تک بھی دور کر سکو گے؟ ورنہ پھر ہمارے گیروے لباس (سنیاسیوں کا لباس) کا فائدہ کیا ہے......؟ کبھی کبھی میں اپنے دل میں سوچتا ہوں کہ مٹھ وغیرہ قائم کرنے سے کیا حاصل؟ کیوں نہ انھیں بیچ کر دہی رقم اِن غریب نارائنوں میں تقسیم کر دی جائے؟ ہمیں گھروں کی کیا پروا ہے، ہم نے تو درختوں کے سائے کو اپنا گھر بنا لیا ہے؟ افسوس! ہمارے حلق سے ایک نوالہ بھی کس طرح اُترتا ہے جب کہ ہمارے ہموطنوں کے پاس نہ پیٹ کے کھانا ہے اور نہ جسم ڈھانکنے کے لئے کپڑا؟...... ماتا! کیا ان کا کوئی علاج نہیں ہے؟ تمھیں معلوم ہے کہ میرے مغرب میں جا کر تبلیغ کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ دیکھوں میں اپنی قوم کے لئے وہاں سے کچھ حاصل کرنے کا ذریعہ نکال سکتا ہوں۔ ان کا افلاس اور دُکھ دیکھ کر میں کسی کسی وقت یہ سوچتا ہوں کہ ہمیں پوجا کے یہ سارے لوازم

جیسے سنکھ پھونکنا، گھنٹے بجانا اور مورتیوں کے سامنے آرتی اُتارنا، سب کو دور پھینک دینا چاہئے۔ ہمیں اپنے علم کے غرور، شاستروں کے مطالعہ اور شخصی نجات (مکتی) حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کی ریاضتوں کو ختم کر دینا چاہئے اور گاؤں گاؤں پھر کر اپنی زندگی کو غریبوں کی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہئے اور دولت مندوں کو غریبوں کے متعلق اُن کے فرائض کا احساس دلاکر اور اُن پر اپنی روحانیت، کردار اور زاہدانہ زندگی کا اثر ڈال کر اُن سے دولت حاصل کرنا اور غریبوں کی خدمت میں لگانا چاہئے......، افسوس! ہمارے ملک میں کسی کو گرے ہوؤں، غریبوں، پریشاں حالوں کا خیال نہیں ہے، تمھارے ملک میں کون ہے جو اُن سے ہمدردی کرتا اور اُن کی خوشی اور تکلیف میں شریک ہوتا ہے؟ غور کرو! ہندوؤں کی طرف سے اسی ہمدردی سے محروم رہنے کی وجہ سے مدراس پریسیڈنسی میں کتنے نیچی ذات کے لوگ عیسائی بنتے جا رہے ہیں! یہ نہ سمجھو کہ یہ صرف بھوک کی تکلیف ہے جو انہیں عیسائی مذہب قبول کرنے پر مجبور کرتی ہے، نہیں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ تمھاری ہمدردی سے محروم ہیں۔ تم اُن سے مستقل کہتے رہتے ہو، مجھے نہ چھوؤ! یہ نہ چھوؤ، وہ نہ چھوؤ! کیا ملک میں کسی قسم کا انسانی جذبہ یا دھرم کا احساس رہ گیا ہے؟ اب یہاں صرف چھوت چھات رہ گئی ہے! ایسے ذلیل رواجوں کو آگ لگا دو! میرا کتنا جی چاہتا ہے کہ اس چھوت چھات کی حدیں توڑ ڈالوں، باہر نکلوں اور سب کو یہ آواز دے کر ایک کر دوں کہ وہ سب لوگ آؤ جو غریب اور بے آسرا ہو، پست حال اور گرے ہوئے ہو۔ رام کرشن کے نام پر ہم سب ایک ہیں! جب تک یہ نہیں اٹھائے جائیں گے بھارت ماتا کبھی بیدار نہیں ہوں گی! ہمارے وجود سے فائدہ اگر ہم اُن کے لئے کھانا کپڑا فراہم نہیں کر سکتے؟ افسوس یہ لوگ دُنیا کے کاروبار سے

ناواقف ہیں اس لئے دن رات محنت کر کے بھی اپنی روزی نہیں کما سکتے۔ اپنی ساری قوت جمع کر لو اور اُن کی نگاہوں سے پردے ہٹا دو۔ جو بات میں بالکل صاف دیکھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اُن میں بھی وہی برہم، وہی شکتی ہے جو مجھ میں ہے! صرف اس کے مدارجِ ظہور میں فرق ہے، بس۔ کیا تم نے تاریخ عالم میں کبھی کوئی ایسا ملک دیکھا ہے جو اس وقت تک سر بلند ہو سکے جب تک کہ اس کے سارے جسم میں قومی خون یکساں طور پر گردش نہ کر رہا ہو؟ اس بات کو گرہ میں باندھ لو کہ جس جسم کا ایک عضو بھی مفلوج ہے وہ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا......"

ایک غیر سنیاسی شاگرد نے ہندوستان میں اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی دشواریوں کی طرف اشارہ کیا۔ ویکانند نے کسی قدر ناراضگی کے لہجہ میں جواب دیا "اگر تمھیں کوئی کام بیحد مشکل نظر آتا ہے تو یہاں نہ آؤ، خدا کے فضل و کرم سے ہر چیز آسان ہو جاتی ہے تمھارا فرض یہ ہے کہ مذہب اور ذات کا امتیاز کئے بغیر ہر غریب اور لاچار کی خدمت کرو۔ تمھیں اس کی کیا پڑی ہے کہ تمھارے عمل کا انجام کیا ہو گا؟ تمھارا کام یہ ہے کہ تم عمل کئے جاؤ، وقت انھیں ٹھیک راہ پر لگا دے گا اور کام خود بخود چل نکلے گا...... تم سب ذہین نوجوان ہو اور میرے شاگرد ہونے کے مدعی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے کیا کیا ہے؟ کیا تم کسی دوسرے کے لئے اپنی جان نہیں دے سکتے؟ ویدانتوں کے پاٹھ اور مراقبہ کی مشق کو دوسرے جنم کے لئے اٹھا رکھو! اس جسم کو دوسروں کی خدمت میں لگ جانے دو، تب میں سمجھوں گا کہ تم میرے پاس یوں ہی نہیں آئے تھے!"

تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے پھر کہا: "اتنی تپسیا کے بعد میں نے جانا ہے کہ سب سے بڑی صداقت یہ ہے، وہ ہر وجود میں ہے! ساری چیزیں اس کے مختلف

مظاہر ہیں۔ اس میں کسی دوسرے خدا کی تلاش کی ضرورت نہیں ہے! وہی اور صرف وہی خدا کی پرستش کرتا ہے جو ہر شخص کی خدمت کرتا ہے!"

یہ عظیم خیالات واضح طور پر ہمارے سامنے ہیں۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح آخری درخشانی کے غائب ہونے سے پہلے یہ بادلوں کو چیر کر باہر آ گئے ہیں (ان کا خلاصہ ہے) تمام انسان برابر ہیں، سب ایک ہی خدا کے بیٹے ہیں، سب کے اندر ایک ہی خدا ہے، دوسرا کوئی خدا نہیں ہے۔ جو خدا کی خدمت کرنا چاہتا ہے اُسے انسانوں کی خدمت کرنا چاہیئے اور سب سے پہلے اُن انسانوں کی جو سب سے زیادہ ذلیل، غریب اور پست حال ہیں۔ ساری حد بندیوں کو توڑ دو۔ اپنے ہاتھ بڑھا کر اور خوشی کا نغمہ "بھائیو!" گا کر "چھوت چھات" کی غیر انسانی روش کا جواب دو، جو اگرچہ ہندوستان میں اپنی سب سے زیادہ ظالمانہ شکل میں رائج ہے لیکن صرف یہیں نہیں ہے (یورپ کی ریاکاری بھی اپنے اچھوت رکھتی ہے، جن سے وہ دامن بچاتی ہے۔)

دویکانند کے شاگردوں نے اس آواز پر لبیک کہا۔ رام کرشن مشن غریبوں اور اچھوتوں کی مدد میں انتھک لگا ہوا ہے اور خاص کر اُن سنتھالوں کی دیکھ بھال کر رہا ہے جنھیں مرتے وقت سوامی دویکانند اُسے سونپ گئے تھے۔

ایک اور رہنما نے اُن کے ہاتھ سے مشعل لے لی ہے جو یہ آواز دیتے تھے: "تمام غریب اور لاوارث لوگو آؤ! وہ سب آؤ جو پیروں کے نیچے روندے جا رہے ہو! ہم سب ایک ہیں!" اُس نے بھی یہ مقدس جہاد جاری کر رکھا ہے کہ اچھوتوں کو اُن کے حقوق اور وقار واپس دلا دے اور وہ شخص موہن داس کرم چند گاندھی ہے۔

• • • • • •

جب وہ ختم ہو رہے تھے تو اُن کی تمکنت نے غرور کی بے حقیقتی کا احساس کر لیا اور اُن پر یہ منکشف ہوا کہ عظمت چھوٹی چھوٹی چیزوں میں ہوتی ہے، "خاکساری اور مجاہدانہ زندگی" میں۔

انھوں نے نویدتا سے کہا: "میری عمر جتنی بڑھتی جا رہی ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں چھوٹی چھوٹی چیزوں میں عظمت کی تلاش زیادہ کرنے لگا ہوں ...... جو کسی بڑی جگہ پر ہے وہ تو بڑا ہوتا ہی ہے۔ تیز روشنی ڈالی جائے تو ایک بزدل بھی بہادر نظر آسکتا ہے۔ دنیا اوپر ہی کی طرف دیکھتی ہے۔ مجھے اصل بڑائی اس کیڑے میں نظر آتی ہے جو خاموشی سے اپنا فرض انجام دے رہا ہے، جو ہر لمحہ اور ہر ساعت اپنے کام میں ثابت قدمی سے لگا ہوا ہے۔"

جب موت قریب آئی تو انھوں نے بے خوف ہو کر اس کا مقابلہ کیا اور اپنے تمام شاگردوں کو یاد کیا، اُن کو بھی جو سمندر پار تھے۔ اُن کے سکون سے وہ لوگ مغالطہ میں تھے، اُن کا خیال تھا کہ ابھی اُن کی زندگی کے تین چار سال باقی ہیں، جب کہ خود اُنھیں یہ احساس تھا کہ اُن کی رخصت کی شام آگئی ہے لیکن انھوں نے اپنا کام دوسروں کے ہاتھ میں چھوڑتے ہوئے کسی قسم کے رنج کا اظہار نہیں کیا۔

اُنھوں نے کہا: "کتنی بار ایسا ہوا ہے کہ ایک شخص ہمہ وقت اپنے شاگردوں کے ساتھ رہ کر اُنھیں برباد کر دیتا ہے۔"

اُنھوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ وہ اُن سے دور چلے جائیں تاکہ اُن کا نشو و نما آزادانہ ہو۔ اُس زمانے کے مسائل پر رائے دینے سے اُنھوں نے

بالکل انکار کر دیا اور کہا۔" اب میں بیرونی مسائل میں بالکل نہیں اُلجھ سکتا۔ میں کوچ کے راستے پر چل کھڑا ہوا ہوں۔"

۴ جولائی ۱۹۰۲ئ جمعہ کے دن، جو سب سے اہم دن تھا، وہ بیحد پُرجوش اور مسرور معلوم ہو رہے تھے، جیسے کئی سال سے کبھی نظر نہیں آئے تھے۔ وہ بہت سویرے اُٹھ بیٹھے۔ عبادت گاہ میں جاکر تمام دروازے کھول دینے کی عادت کے خلاف، اُنھوں نے کھڑکیاں بند کر لیں، اور دروازوں میں چٹخنیاں لگا دیں۔ وہاں وہ تنہا آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک مراقبہ میں رہے اور اُنھوں نے کالی ماتا کا ایک خوبصورت بھجن گایا۔ جب وہ صحن میں آئے تو بالکل تبدیل ہو گئے تھے۔ شاگردوں کے درمیان اُنھوں نے خواہش کے ساتھ کھانا کھایا۔ اس کے فوراً بعد نئے طلباء کو تین گھنٹے تک سنسکرت پڑھائی اور اس وقت وہ زندگی اور خوش مزاجی سے بھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ پھر وہ پریما نند کے ساتھ بیلور کی سڑک پر تقریباً دو میل تک ٹہلے، اُن سے اپنے ویدک کالج اور ویدک تعلیم کی تجاویز بیان کیں اور کہا کہ "میں توہمات کا خاتمہ کر دوں گا۔"

شام ہوئی، اپنے ساتھی سنّیاسیوں سے اُنھوں نے آخری محبت آمیز گفتگو کی اور قوموں کے عروج و زوال کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "ہندوستان لافانی ہے اگر وہ خدا کی جستجو میں ثابت قدم رہتا ہے لیکن اگر وہ سیاسی اور سماجی جھگڑوں میں پڑا تو ختم ہو جائے گا۔"

سات بجے...... عبادت گاہ کے گھنٹے آرتی کے لئے بجے...... وہ اپنے کمرے میں گئے اور باہر گنگا پر نظر ڈالی۔ اس کے بعد جو نیا طالب علم

اُن کے ساتھ تھا، اُسے انھوں نے اپنے مراقبہ کے بے خلل رہنے کے خیال سے باہر بھیج دیا۔ پینتالیس منٹ کے بعد انھوں نے اُسے بُلایا اور ساری کھڑکیاں کھُلوا دیں، بائیں کروٹ فرش پر لیٹ گئے اور بے حس و حرکت پڑے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مراقبہ میں ہیں۔ ایک گھنٹہ کے بعد وہ مُڑے اور ایک گہری سانس لی، کچھ لمحوں کے لئے خاموشی رہی، اُن کی نظریں اُن کے بپوٹوں کے وسط میں جمی رہیں، پھر دوسری سانس لی ...... اور ابدی سکوت طاری ہو گیا۔

سوامی کے ایک ساتھی سنیاسی نے بتایا کہ "اُن کے نتھنوں میں، مُنھ کے قریب اور آنکھوں میں ایک ذرا سا خون تھا۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے "کُنڈلینی شکتی" کے مراقبہ میں چلے گئے ہیں، آخری وجد و جذب کے عالم میں، اُن کے کام مکمل ہو جانے پر جس کا دعوٰے رام کرشن نے اُن سے کیا تھا۔

اُن کی عُمر انتالیس سال کی تھی۔

رام کرشن کی طرح دوسرے دن وہ بھی اپنے بھائی اور شاگرد سنّیاسیوں کے کندھوں پر فتح وظفر کے نعروں کے درمیان چِتا پر لائے گئے۔

عالمِ خیال میں مَیں فتحمندی کے وہ نغمے سن سکتا ہوں جو رام ناد کے فاتحانہ داخلہ کی طرح تھے اور جو اس عظیم الشان کھلاڑی کے آخری مقابلہ کے بعد اُسے سلامی دینے کے لئے بلند کئے گئے تھے۔

———:(٥):———

سوامی وویکانند نئے ہندوستان کے عظیم ترین معماروں میں سے تھے۔ وہ بیک وقت ایک روشن ضمیر پیغامبر اور ایک باعمل انسان تھے جس نے اپنے اہلِ وطن کو رُوحانی، اخلاقی اور ذہنی غفلت کی نیند سے بیدار کیا۔ ان کا پیغام آفاقی تھا کیونکہ بنی نوعِ انسان کے اندر چھپی ہوئی ربّانی توانائی پر زور دیتے تھے۔ مشہور فرانسیسی ناول نگار اور نوبل انعام یافتہ رومیں رولاں نے اُن کے متعلق لکھا ہے کہ: "میں اُن کے اقوال کو، اپنے جسم میں بجلی کے لمس سے پیدا ہونے والے جھٹکے محسوس کئے بغیر لکھ ہی نہیں سکتا۔ جب یہ اُس سورما کے لبوں سے شعلہ بار الفاظ کی شکل میں ادا ہوئے ہوں گے، اُس وقت اِن میں کتنا زور رہا ہوگا!" رومیں رولاں سوامی وویکانند کی شخصیت سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے ان کی سوانح عمری لکھی، ایک عظیم الشان زندگی کی کہانی ایک عظیم المرتبت صاحبِ قلم کی زبانی، سوامی وویکانند کے صد سالہ جشن ولادت کے موقع پر اُردو کے قارئین کے لئے رومیں رولاں کی یہ حیاتِ وویکانند پیش کرتے ہوئے ساہتیہ اکاڈمی اظہارِ مسرت کرتی ہے۔ اکاڈمی، مایاوتی کے اَدویت آشرم کی شکر گذار ہے کہ اُس نے اِس تصنیف کو ہندوستان کی زبانوں میں پیش کرنے کی اجازت دی۔